۸۶ء

مخدوم الملک سید شمس الدین (خامس) گیلانیؒ

کے کلام کا

انتخاب

ارمغانِ اوچ

مرتبہ:-

سرائیکی ادبی مجلس بہاولپور

۱۹۶۶ء

اِنتساب

جو قوم اپنی تاریخ کی حفاظت نہیں کرتی تاریخ اس قوم کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹا دیتی ہے۔

اُوچ کی تاریخ اوچ کے تبرکات تاریخ برِصغیر ہی نہیں تاریخ عالم کا اہم ترین حصہ ہیں۔ تاریخ عالم کے اس اہم ترین مرکز میں گذرے بیتے واقعات مقامی روایات کے آثار کی بحالی برآمدگی کے سلسلہ میں مخادیم اوچ ایران بہاولپور اور کمشنر صاحبان ڈویژن نے علیٰ قدر فکرونظر قابلِ تعریف خدمات انجام دی ہیں۔

"ارمغانِ اوچ" اس لحاظ سے بھی کہ بہاولپور ڈویژن کے موجودہ کمشنر صاحب کے عہد میں پایۂ تکمیل کو پہنچی ہے۔ اور اس حقیقت کے اعتراف کے طور پر بھی موصوف نے اپنے عہدہ کی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اس علاقہ کے رمضانیوں کے جان مال کی بردہی کی نہیں بلکہ مقامی باشندگان کے زبان و ادب رسم و رواج ڈویژن کے چوتھے ضلع کے منصوبہ جات سیاحت وغیرہ اور آثارِ قدیمہ اوچ وغیرہم کے متعلق حسب ذوق فکر و عمل سے تم باذتی کرنا شروع کر رکھا ہے۔ اُس خدمت اس فیض رساں قیادت کا مخلصانہ یہ اعتراف ہے کہ میں مخدوم الملکؒ کے کلام کے انتخاب "ارمغانِ اوچ" کو سید حسین حیدر صاحب سی ایس پی کمشنر بہاولپور ڈویژن کے نام سے معنون کر رہا ہوں۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

نذیر علی شاہ
فوجی بستی۔ بہاولپور

۱۵/ اکتوبر ۱۹۶۶ء

ارمغانِ اوچ کے متعلق چند دلچسپ تفصیلات

مقامِ تصنیف:۔ برصغیر پاک و ہند میں اوچ کو زمانہ قدیم سے "مدینۃ الحکما" ایتھنز کی طرح "مدینۃ السادات" کہلانے کا شرف حاصل ہے۔ اُم القریٰ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ مدینۃ النبیؐ کو خالق کائنات نے جس غرض و غایت کے لئے دُنیا کی افضل ترین بستیاں ہونے کا شرف عطا فرمایا ہے اور باری تعالیٰ کی اس حکمت کا فیض جس طرح آج تک جاری و ساری اور قیامت تک فیض بار رہے گا۔ عیاں راچہ بیاں، واضح اور روشن ہے۔ اس برصغیر میں برصغیر کا کوئی دوسرا شہر یا قریہ بلحاظ مرکزِ علم و دانش اوچ متبرکہ کی قدامت کو نہیں پہنچتا (ملاحظہ ہو امپیریل گزیٹیئر آف انڈیا ۔ مصنفہ جان گنفتر ۔ سنٹرل لائبریری بہاولپور)

مسلمانوں کی آمد سے ہزاروں سال پہلے اوچ برصغیر میں ہندو۔ بدھ بلکہ ان سے بھی پہلے کے ادیان کا مرکز تھا۔ اوچ کو اس برصغیر میں اور حرمین شریفین کو دُنیا بھر میں اس شرف کے بخشنے کی حکمت، اللہ باری تعالیٰ کے پروگرام کا ایک ایسا عنوان ہے کہ جس کے سمجھنے اپنانے میں نوعِ انسانی کے لئے فلاحِ دارین ہے۔ اسلامی مرکز و تنظیم کے (SUB DIVISION) سب ڈویژن کے ہیڈ کوارٹرز کی حیثیت سے اوچ اس وقت تک اپنے فرائض حتی الامکان خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیتا رہا ہے۔ (ملاحظہ ہو:۔ دی پریچنگ آف اسلام مصنفہ سر تھامس ارنلڈ۔ سنٹرل لائبریری بہاولپور)

عباسی فرمانروایانِ ریاست بہاولپور کی اوچ متبرکہ کے ساتھ صد سالہ عقیدتمندی یورپی ممالک کے مسیحی حکمرانوں اور ویٹیکن کے تعلقات سے زیادہ پُر خلوص اور قابلِ داد رہی ہے۔ وادیٔ سندھ کے تیز و تند پانچ دریاؤں کے سنگم پر واقع ہونے کے باوجود سمجھ نہیں آتا۔ اوچ اپنے مقام پر موہنجو ڈارو کے پُر بہار زمانہ سے بھی پہلے سے آباد ہزاروں سال عمر ہو جانے پر بھی اب تک، کیوں چلتا پھرتا ہنستا بولتا زندہ و سلامت ہے

جس طرح آج سے تقریباً آٹھ سو سال پہلے ناصر الدین قباچہ کے توسط سے اوچ کے تعلقات سرکار دہلی سے وابستہ تھے۔ آج بھی پاکستان سرکار سے اوچ کے تعلقات سید شمس الدین شاہ مخدوم اوچ گیلانی ممبر صوبائی اسمبلی کے توسط سے وابستہ ہیں۔

اوچ کی اہمیت زمانہ مستقبل میں :- بین الاقوامی کھینچ تان کے پیش نظر برصغیر کا یہ علاقہ تیسری عالمگیر جنگ کے سلسلہ میں کبھی ضربیاتی مرکز بننے کے لئے مجبور ہو جائے، بعید از قیاس نہیں۔ تخلیقات، الات غارتگری میں ید طولیٰ حاصل ہو جانے کی وجہ بجائے سترہ دن آئندہ سات دن شاید سات گھنٹوں میں ہار جیت کا فیصلہ ہو جانا ناممکن نہیں۔ تواریخی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ شدید قسم کی ضرر رساں جنگوں کے بعد کچھ اس قسم کے ذہنی انقلاب رونما ہوا کرتے ہیں کہ جن کا نتیجہ :-

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

ہو کر رہے کوئی نئی بات۔ نہیں ہوتا۔

حال ہی میں شکاگو یونیورسٹی (امریکہ) کے ایک پروفیسر صاحب کارلوکوپولا (جو گذشتہ تین سال سے امریکہ سے ایک رسالہ محفل "نکال رہے ہیں،) کی طرف سے صادق پبلک سکول بہاولپور کے پروفیسر ریاض الدین احمد صاحب کی خدمت میں یہ اطلاع موصول ہوئی ہے کہ "سرائیکی" زبان و ادب اور خواجہ غلام فریدؒ کی کافیوں کے متعلق معلومات اور مضامین رسالہ محفل" میں شائع کرنے کے لئے درکار ہیں۔ الحمد للہ اس سلسلہ میں سرائیکی ادبی مجلس بہاولپور کی نصف درجن مطبوعات خدمت انجام دینے کا ذریعہ بن سکی ہیں۔ ریاض صاحب کی وساطت سے بذریعہ ہوائی جہاز سرائیکی زبان کی نایاب کتب کا پہلی دفعہ امریکہ موصول ہونا سرائیکی زبان کی تاریخ کا یقیناً" قابل فخر واقعہ ہے۔ علیٰ ہذا القیاس پنجاب یونیورسٹی کے عظیم کارنامہ "پاک و ہند میں مسلمانوں کے ادب کی تاریخ" کے مرتب کرتے ہیں جہاں تک سرائیکی زبان اور ادب کا تعلق ہے سرائیکی ادبی مجلس قابل قدر خدمت انجام دے سکے، توقعات ہیں۔

پاکستان میں آئے دن عربی۔ ترکی۔ ایرانی۔ چینی۔ روسی ثقافتی وفود کا آنا اس امر کی

دلیل ہے کہ یہ ذہنی فکری بین الاقوامی ہچل، عالمگیر فکر و نظر عقیدہ و عمل (اسلام ہی) کی تصدیق مزید کا ذریعہ ثابت ہوگی۔

نی زمانہ علم سائینس اپنے عروج کی اس منزل پر پہنچ چکا ہے۔ کہ جہاں سے آگے اترائی تو ہے چڑھائی نہیں۔ زوال تو ہے اقبال نہیں۔ ثمر کے پختہ تر ہو چکنے کے بعد اگر اُسے مزید منفعت کیلئے شاخ شجر پر ہی چھوڑ دیا جائے تو فیض رساں ہونے کی بجائے وہ پھل گل سڑ کر بیکار ہو جاتا ہے۔ یعنیہ علم الابدان میں نی زمانہ ضرورت سے زیادہ تجسس نوع انسان کی بربادی کا باعث ہو تو ہو نوعِ انسان کی خوشحالی کا موجب نہیں بن سکتا۔

"عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا" غالبؒ

پہلی اور دوسری عالمگیر جنگ سے یہ ایک نتیجہ اچھا برآمد ہوا ہے۔ کہ دانایانِ فرنگ (مستشرقین) کی کافی تعداد کلام میر و سودا۔ جامیؔ و سعدیؔ۔ اقبالؔ و نذر الاسلام میں دلچسپی لینا شروع کی ہے۔ ڈاکٹر یان مارک (چیکوسلواکیہ) پروفیسر الزا اندرو لیسانی (اطالیہ) ڈاکٹر شیمل (جرمنی)، جین پال ساطر (فرانس)، برطانیہ کے لارڈ رسل۔ امریکہ کے ویل ڈوران مفکرین چین اور روس اسلامی علم و حکمت سے (حبیب دیار رخ بتوں نے تو خدا یاد آیا) متاثر ہونے شروع ہیں۔ پاکستانی قومی زبان و ادب (اردو و بنگالی) اور پاکستانی علاقائی (پشتو۔ پنجابی سندھی۔ سرائیکی) زبان و ادب کی انسانیت ساز روایات کے ان گنت خزانے اگر بروئے کار لائے جاسکیں پاکستان عالمی امن کے سلسلہ میں نمایاں خدمت انجام دے سکتا ہے

تواریخی طور پر یہ بات واضح لعد روشن ہے کہ دریاؤں نے تہذیب و تمدن کے نکھارتے ابھارنے میں عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں۔ وادئی سندھ کے پانچ دریاؤں کے سنگھم پر واقع یہ قدیم بستی (اوچ)، ایک دفعہ پھر علوم باطنی کا پُر شباب مرکز بن سکنے توجہ کی ضرورت ہے۔ اسی سلسلہ میں جامعہ اسلامیہ بہاولپور۔ محکمہ اوقاف اور پاکستانی مفکرین مستغربین کی حیثیت سے حقیقت عقبیٰ کی خوبیوں سے روشناس کرکے عقبیٰ ناآشنا اقوام و ملل کی رہنمائی کریں۔ وقت کی ضرورت واقعات کا تقاضا ہے۔

صاحبِ تصنیف:۔ بیاضاتِ سید کے ایک درجن قلمی نسخوں سے اخذ کرکے حضرت

مخدوم الملک سید شمس الدین خامس گیلانی آف اوچ متبرکہ کے اردو۔ فارسی کلام کا انتخاب بعنوان ارمغانِ اوچ پہلی دفعہ مطبوعہ شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ بلحاظ حال و قال صاحبِ تصنیف کے زمانہ کے معیارِ زندگی کس حد تک سادہ تھے۔ کلامِ سید اور گروپ فوٹو مشمولہ کتاب ہٰذا سے ظاہر ہے۔ ساداتِ اوچ چوتھی صدی ہجری - دنیا کے پُر آشوب زمانہ میں جب ملتِ اسلامیہ کے دونوں محاذوں (صلیبیوں اور تاتاریوں) مشرق و مغرب پر مسلمانوں نے دشمنانِ اسلام کو فیصلہ کن شکست دے دی تھی، ارضِ مقدس سے براستہ بغداد گیلان۔ دمشق بخارا ہوتے ہوئے اوچ تشریف لاتے تھے۔ یہ اُس زمانہ کی بات ہے، جب اس علاقہ میں سو میں سے صرف پانچ گھر مسلمانوں کے ہوں تو ہوں۔ تیسری صدی عیسوی سے پانچویں صدی عیسوی تک یورپ۔ انگلستان میں دینِ مسیحی کے پھیلنے اور گیارھویں صدی عیسوی سے تیرھویں صدی عیسوی تک مشرق و مغرب بالخصوص برصغیر پاک و ہند میں دینِ اسلام کے پھیلنے کے واقعات قابلِ مطالعہ، سبق آموز، دلچسپ داستان ہے۔ جزیرہ نمائے ہند اور جزیرہ نمائے ہسپانیہ میں جس خوش اسلوبی سے ان ممالک کے اصل باشندگان اپنے اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ چھوڑ کر بطیب خاطر مسلمان ہوتے ہیں۔ عیسائی یہودی یا کسی اور مذہب کے پھیلنے کا ایسا ریکارڈ نہیں۔ نور الدین جیسا بے پرواہ نوجوان مہر النساء کی جس ادا پہ فریفتہ ہوا تھا۔ وہ ادا مہر النساء کی عیاری نہ تھی۔ مہر النساء کی سادگی تھی۔ بعینہٖ دینِ متین کی سادگی کا نتیجہ تھا۔ کہ اس زمانہ کی متمدن اقوام میں جب اسلام پھیلنے لگا تو پھیلتا ہی پھیلتا چلا گیا اسلام کی سادگی چین اور روس کے عوام کے دلوں کو اب پھر کب کس طرح موہ لیگی، خود مسلمانوں کے سادگی اسلام کے اصولوں پر کاربند رہنے پر منحصر ہے۔

اوچ اور گیلانی ساداتِ اوچ کے بارے میں معلومات فراہم کی جا سکیں۔

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کیلئے

صاحبِ تصنیف کے حالاتِ زندگی اور اوچ کے دینی مرکز ہونے کی تفصیلات کسی صاحبِ نظر علامہ کے قلم کے منتظر ہیں۔

تصنیف ہٰذا: رمضانِ اوچ سے گذشتہ ایک صدی ۱۸۶۶ء تا ۱۹۶۶ء کی برصغیری

تاریخ وابستہ ہے۔ مخدوم الملک کی بیاضات سے جو تاریخ اخذ کی گئی ہے۔ اس کی رُو سے سن تحریر ۱۲۳۵ھ پایا جاتا ہے۔ یعنی وہ زمانہ جب ریل تار کا اس علاقہ میں رواج نہ ہو پایا تھا۔ لباس رواج مقامی بھاری بھرکم بچے تنگے پر قناعت۔ صورت و سیرت کی دم تھے۔ بول چال تیکوں میکوں۔ ایں کوں اوں کوں۔ سواری برداری کے لئے اونٹ گھوڑے گھگی بہلی رتھ۔ بیل گاڑی ہی کافی سمجھے جاتے تھے۔ اس سے زیادہ تیز سواری۔ پختہ سڑکوں کی ضرورت نہ تھی۔ زیادہ سے زیادہ سات دس کوس دیس پردیس آنے جانے کی ضرورت رسوں میں پیش آیا کرتی تھی۔ باشندگانِ علاقہ نسلاً بعد نسل تقریباً ایک ہی قبرستان بلکہ شاید ایک ہی قبر میں دفن کیئے جاتے ہوں۔ کیا تعجب؟ ضروریاتِ زندگی کم تھیں مسٹر موہری پنڈ کھدر ڈوہر مٹ مٹھرے منگر تباؤں ہوم میڈ کی کمی نہ تھی کہ جام سال اگر ٹرٹ۔ جاما تولینے کیلئے بازار جاتے۔ سنہ ۱۸۶۶ء میں انگریزوں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس ریاست کو اپنی تحویل میں لے کر احسان فرمایا تھا۔ اس زمانہ کے ملتان کے انگریز کمشنر مسٹر فورڈ بہاولپور میں جس طرح آئے نہ ہوں بلائے گئے ہوں آئے تھے۔ اپنی قوم کے بیشتر افراد کیلئے ڈبل روٹی مکھن کا خوب انتظام فرمائے گئے تھے۔ موجودہ کمشنر ہاؤس کے ارد گرد فورڈ صاحب کے ہم قوم سول ملٹری افسروں کے بنگلے کلب۔ بینڈ اسٹینڈ اسی جگہ تھے۔ جہاں اب اے ڈی ایم صاحب سول جج صاحبان کے دفتر ہیں۔ ۱۹۲۵ء تک تو انگریزی کرکٹ کورٹ اس جگہ جہاں اب ملک محمد دین صاحب ایڈووکیٹ بیٹھتے ہیں۔ کھڑا تھا۔ اور پاس ہی اب تک انگریز کی عظمت دیرینہ بینڈ اسٹینڈ ایسے گرتے ہوئے آثار زمانہ ماضی کی یادگار کے نوحہ خواں نظر آتے ہیں اسی زمانہ میں تعلیم کی برائے نام ضرورت تھی۔ دس ہزار میں دو گلستاں بوستان کریما تک فارسی پڑھے جو باعث تحریر آنکہ" "منکہ"۔ سکنہ "باخذ رسید بالعوض سی شش ٹنکہ چہرہ شاہی دو شاخ نر گاوان بدست گاموں ولد مدھو فروخت کر چکا ہوں وغیرہ وغیرہ لکھ پڑھ سکیں۔ اس زمانہ میں ۱۲۔ ۲۰ کوس کے علاقہ میں ارسطو۔ ابو الفضل حکیم بیدپا رلے دانشلیم سمجھے جاتے تھے۔ ارمغانِ ایدح مخدوم الملک صاحب موصوف کے کلام کا انتخاب اس زمانہ کی یادگار ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ پنجاب میں حاسدان تیز باطن کے لئے معنوی طور پر بھی اقبال و ظفر پیدا ہو گئے تھے۔

۱۸۳۰ء کی بات ہے برطانوی حکومت کا انگریز نمائندہ الفنسٹن مکتاب ہے۔ خان بہاولپور کے ملازم جو زبان بولتے تھے۔ اس کے یورپیہ ملازمین اس زبان سے قطعی طور پر ناواقف تھے۔ اس قسم کی محدود واقفیتوں، ذرائع اور واقعات کے باوجود اس زمانہ میں حضرت مخدوم الملک صاحب کا لکھا اُردو کلام ولی دکنی کے کلام کیطرح اُردو ادب کی تاریخ کے سلسلہ کی قابلِ قدر کڑی سمجھا جائے بعید از انصاف نہیں۔ پُرانے زمانے کی تحریر۔ طرز نوشت مشکل ہونے کے علاوہ آج سے تقریباً ایک صدی پہلے کے ورق اوراق کا دستبرد زمانہ کے ہاتھوں اُلٹ لٹ جانے کی وجہ یہ ارمغان مکمل طور پر بر آمد کر کے پیش کر سکنا آسان نہیں۔ ان دشواریوں کے پیشِ نظر واقف الاسرار اصحاب کی خدمت میں درخواست ہے۔ متعدد خامیاں، غلطیاں گوارا فرماتے ہوئے طباعتِ ثانی کے لئے اپنے اپنے قیمتی مشورات سے ممنون فرمائیے

فکری قدریں ضرورتِ زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتی ہی رہتی ہیں۔ چنانچہ ایک زمانہ تھا کہ لوگ:۔

دہلی میں ——— گوری کتنے کو بیچوگی بالاجوبن
لاہور میں ——— مجھی تیریاں گول پنیاں
بہاولپور میں ——— جُل مِل موچی مغورا

گایا سُنایا کرتے تھے۔ یا پھر یہ دَور آیا کہ پاکستان بھر میں۔ زبان زبان پر تھا۔ ہم لے کر رہیں گے پاکستان۔

تو ہم آزاد ہو کر ہی علاقائی زبانوں اور علاقائی ادب کی قدردانی خاطر خواہ طور پر کر سکتے ہیں۔ سرائیکی کے حقوق کا پشتو پنجابی سندھی کیطرح تحفظ کرنے میں ملک و قوم کا فائدہ ہی ہے نقصان نہیں منفرد فکر و نظر ادا۔ بقا کی حامل سرائیکی کو اس کا فیوں کا تقاضا ہے کہ سرائیکی کو سرکاری طور پر علاقائی زبان کا درجہ پائے۔ اخیر میں قدردان کامل حاضرین کا تہ دل سے شکریہ ادا کر دیا جاتے میرا خوشگوار فرض ہے۔

ارمغانِ پاوچ سید کے قدردانوں کی جمعیت کی ۔۔۔ کے لئے نسلاً بعد نسل ابدالآباد تک حضرت مخدوم الملک کے اس ارشادِ گرامی کی یاد [illegible] کا ہے

اکھیں لگے چادر تریبہ نالو نرگس ✦ کہ تو نال جھوندھگ ہم پہ بہ مزار سے فیض

بادیہ۔ قوجی بستی۔ بہاولپور
گدا گدیہ سید نذیر علی شاہ

سید بانثوء الحدری

دادِ سخن شناس

اوچ ــــــ وادیٔ سندھ کی تہذیبی تاریخ کا ایک جلی عنوان رہا ہے۔ ایسا جلی عنوان جو اپنے دور کی سیاست و تجارت۔ علم و عرفان اور مذہبی و رُوحانی فیضان کی بے پناہیوں پر محیط ہے۔

اوچ ایک شہر نہیں مملکت تھا جس کی وسعتیں مغربی پاکستان گیر تھیں ــــــ یہ ایک دور نہیں ادوار کی تاریخ ہے۔ جس کی تین ہزار سالہ قدامت ایل و نہار کی کروڑوں گردشوں تک پھیلی ہوئی ہے اپنے اس عظیم ماضی کے ہر عہد میں اوچ تاریخ ساز رہا ہے۔ اور مختلف حیثیتوں میں عروج کی آخری منزلیں اس کا مقدر رہی ہیں۔

سیاسی اعتبار سے یہ شہر اتنا اہم تھا کہ سکندرِ اعظم نے اسے فتح کرنے کے بعد اپنے نام پر اس کا نام اسکندریہ رکھا۔ محمد بن قاسم نے اسے زیرِ نگین لانا ضروری سمجھا۔ سومروں نے اسے دارالخلافہ بنایا۔ محمود غزنوی نے اس کی مرکزیت پہ ضرب لگائی۔ شہاب الدین غوری نے اسے کا ملاً اسلامی سلطنت بنا دیا۔

رُوحانی اعتبار سے اوچ کی عظمت ایک دور میں اتنی بلند تھی کہ سلاطین رفتنت یہاں اپنی حاضری فرض تصور کیا کرتے تھے۔

خواجہ صفی الدین گازرونی سے سید جلال الدین سُرخ بخاری اور مخدوم جہانیاں جہاں گشت سے حضرت سینگی غوث تک صوفیائے کرام کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ جن کے انوار سے برصغیر ہند و پاک کے اندھیارے روشن ہوتے رہے اور افق تا افق اسلام کا نور پھیلتا چلا گیا۔

علمی اعتبار سے اوچ کو اولیت و انفرادیت کا یہ امتیازی مقام حاصل ہے۔ کہ چھٹی صدی ہجری میں وہ ایسے دارالعلوم کا مرکز تھا جس میں برصغیر ہند و پاک ہی کے نہیں افغانستان

ایران اور ترکستان کے ہزاروں طلباء بیک وقت تحصیل علم کیا کرتے تھے۔ برصغیر کی یہ پہلی اسلامی یونیورسٹی جسے طبقات ناصری کے مشہور مصنف منہاج الدین سراج نے قائم کیا تھا۔ آگے چل کر دارالعلوم فیروزیہ کے نام سے مشہور ہوئی اور یہیں سے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی تحریک نے جنم لیا۔ علم و فضل کی فراوانی کے باعث اپنے دور کے معروف فضلاء، فصحا، علماء اور مورخین اوچ جمع ہو گئے تھے جن کا علم سینہ بسینہ نسل در نسل منتقل ہوتا رہا۔ ———

اگرچہ سلطنتوں کے عروج و زوال کے باعث اوچ کی مرکزی اہمیت اور علمی مرکزیت بتدریج کم ہوتی گئی۔ مگر علمی فیضان کا تسلسل کسی نہ کسی صورت میں بدستور قائم رہا۔

انقلابات زمانہ کی تباہ کاریوں کے نتیجے میں آج کا اوچ کھنڈرات کی بستی ہے لیکن اس بربادی کے باوجود اس کی تاریخی اہمیت برقرار ہے۔ اور آج بھی وہ عظمت قدامت میں موہن جوڈرو اور ہڑپہ کی حریف نظر آتی ہے۔ گوش ہوش ہو تو اس کی ویرانیوں میں اب بھی ماضی کی عشرت سامانیوں کی گونج سنی جا سکتی ہے۔ اور چشم بصیرت ہو تو کھنڈرات کی صورت میں اوچ کی کتاب عظمت کی بکھری ہوئی تحریروں کو اب بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

ارمغان اوچ ——— ایک ایسی قابل ستائش کوشش ہے جس کے ذریعہ ایک سو سال پرانے ایک گمنام مخطوطے کو منظر عام پر لا کر اوچ کے قدیم علمی و ادبی سلسلے کی تجدید کی گئی ہے۔ بریگیڈیئر نذیر علی شاہ صاحب کی مشکل پسند طبیعت نے اس مشکل کام کا انتخاب کر کے جستجو پسند طبیعتوں کو تحقیق کی ایک نئی راہ سجھائی ہے۔ جس سے بہاولپور کے ادبی ماضی کی بہت سی پوشیدہ عظمتوں کی نقاب کشائی ہو گی۔

ارمغان اوچ ——— مخدوم شمس الدین خامس سید کے اردو فارسی اور سرائیکی کلام کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ جس قلمی مسودے سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس پر تکمیل بالخیر تاریخ ۱۰ رجمادی الاول ۱۲۹۲ھ درج ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہوا کہ اب سے ٹھیک ایک سو سال قبل یہ مسودہ تکمیل پذیر ہو چکا تھا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ بہاولپور کے کسی تذکرۂ شعراء میں اس کا کہیں کوئی ذکر نہیں۔ اور مخدوم شمس الدین سید کو اس سے پہلے کسی نے [illegible] ۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی کہ یہ نادر مخطوطہ نا قدری

عالم کی نذر ہو کہ سجادہ نشینان اوچ کے نہاں خانوں میں روپوش ہو گیا۔ جہاں اسے مقدس
تبرکات کے ساتھ پڑا جا تو گیا مگر پڑھا نہ گیا۔ اور اگر پڑھا گیا تو اس کی ادبی اہمیت کو سمجھا
نہیں گیا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ تک بہاولپور کے ادبی حلقے اس سے بے خبر رہے کہ ایک سو سال
قبل اس سرزمین میں اردو کا ایک صاحب دیوان شاعر موجود تھا۔ بریگیڈیئر نذیر علی شاہ صاحب
کی سنسنی خیز دریافت سے بہاولپور میں اردو شاعری کی قدامت کی تاریخ از سر نو ترتیب دینی
پڑے گی۔ اور اولیت کا تاج افتخار مخدوم شمس الدین کے سر پر سجانا ہو گا۔ جو زمانے کی فراموش
کاری کے سبب اب تک اس سے محروم رہا ہے۔

بہاولپور کے مؤرخین اور تذکرہ نگاروں کی تحقیق کے مطابق ۱۸۶۶ء سے قبل بہاولپور میں
اردو شاعری کے نقوش تقریباً مفقود ہی ہیں۔ البتہ مولوی نصیر الدین میر منشی ریاست بہاولپور
جو نواب بہاول خاں عباسی رابع کے عہد میں ۱۸۶۶ء سے قبل تھے۔ کی ایک غزل دستیاب
ہوتی ہے۔" جو صادق الاخبار" ۱۸۶۶ء میں شائع ہوئی۔ اور اس کا مطلع یہ ہے۔ ـــ

کیسے خوش سوئے تھے ہم بستر آرام کے بیچ
کیا پیام کر جگا کر، دیا کس کام کے بیچ

مولوی عزیز الرحمن عزیز مرحوم کی اس تحقیق پر بعد کے مصنفین پروفیسر دلشاد کلانچوی
(ریاست بہاولپور میں اردو)، ماجد قریشی (دبستان بہاولپور) اور حیات میرٹھی (نقوش رفتگاں)
نے بھی صاد کر دیا ہے۔ اور مولوی نصیر الدین کی متذکرہ غزل کو بہاولپور میں اردو کی پہلی غزل
قرار دیتے ہوئے مولانا عزیز الرحمن نے اردو کی پہلی غزل قرار دیتے ہوئے مولانا عزیز الرحمن
نے "اردو لٹریچر کی تاریخ" کے عنوان سے آگے چل کر لکھا ہے کہ "۱۸۶۶ء سے ۱۸۷۹ء تک بہاولپور
میں اردو شاعری خاموشی کے ساتھ ہاتھ پاؤں مارتی رہی۔ یکم دسمبر ۱۸۷۸ء کو جبکہ صادق الاخبار
ریاست بہاولپور کا سرکاری گزٹ تھی کی ایڈیٹری کا چارج حافظ عبدالقدوس قدسی نے لیا۔ تو اس
وقت اردو نظم خلوت سے نکل کر جلوہ فرمائے جلوت ہوئی۔"

مولانا عزیز کی اس تحقیق سے سبھی نے اتفاق کا اظہار کیا اور دبستان بہاولپور میں اس
موضوع پر بحث کرتے ہوئے ماجد قریشی نے لکھا ہے کہ بہاولپور میں اردو شاعری کا دور اس

وقت شروع ہوتا ہے جب جانِ عالم پیا کے عروج کا آفتاب مٹیا برج میں غروب ہو جاتا ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کے عظیم ترین مراکز شاعروں کے لئے دار الحرب بن جاتے ہیں اور ان علاقوں کے شعراء تلاشِ معاش میں در بدر مارے مارے پھرنے لگتے ہیں۔ انیس۔ دبیر۔ نظیر۔ مومن۔ ذوق اور غالب اپنے کمالاتِ سخن دکھا کر اس دارِ فانی سے کوچ کر جاتے ہیں۔ اور امیر مینائی داغ۔ تسلیم اور جلالی اسلامی ریاستوں میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ ارشد گورگانی بہاولپور کا رخ کرتے ہیں؟

اگر اس تحقیق کو درست مان لیا جائے تو بہاولپور میں اردو شاعری کی قدامت اور کم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ارشد گورگانی نے یہاں اپنی ملازمت کا آغاز ۱۸۸۲ء میں کیا۔ اور وہ اسی سنہ میں پہلی بار شاعرانہ رنگ میں متوارد ہوئے؟

بہاولپور میں اردو شاعری کے موضوع پر مضمون نگاروں اور تذکرہ نگاروں کی اس تحقیق و تجسس کے تفصیلی مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچنا زیادہ مشکل نہیں کہ انھوں نے مولانا عزیز الرحمٰن کی رائے کو بنیاد بنا کر ایک دوسرے کا تتبع کیا ہے۔ اور براہِ راست مقامی کتب خانوں کی قدیم کتابوں یا قلمی نسخوں سے استفادہ کرنے کی کوشش نہیں فرمائی جس کے نتیجے میں اردو شاعری کی قدامت یہاں ایک صدی کے دائرے میں محدود ہو کر رہ گئی۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دائرہ اگر دو صدی نہیں تو ڈیڑھ صدی تک بہرحال پھیلا ہوا ہے اور مخدوم شمس الدین صاحب سید کے زیر نظر قلمی دیوان نے اس کا حتمی ثبوت فراہم کر دیا ہے۔ یہ دیوان ۱۲۶۸ھ میں تکمیل پا چکا تھا۔ دیوان کی صاف ستھری زبان اور اندازِ بیان سے بآسانی یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دیوان کی تکمیل کے وقت صاحبِ دیوان کا شاعرانہ عمر یہ چالیس پچاس سال سے کم کسی صورت میں نہیں ہو سکتا۔ اس کے ساتھ ہی صاف ستھری زبان کی یہ اردو غزلیں اس بات کی غمازی بھی کرتی ہیں۔ کہ مخدوم صاحب اس سرزمین کے پہلے اردو شاعر نہیں ہو سکتے۔ ان سے پہلے بھی یہاں اردو کی شاعرانہ روایت ضرور ہوگی۔ اور اُوچ کے علمی مرکز ہونے کے باعث یہاں بہت پہلے ایسے لوگ پہنچ گئے ہوں گے۔ جو نہ صرف اردو جانتے ہوں گے۔ بلکہ اردو میں شعر بھی کہتے ہوں گے۔

تحقیق و تجسس کے جویا حضرات کے لئے یہ سوالات اب ایک چیلنج کا درجہ رکھتے ہیں جن کا اگر انھوں نے جواب پا لیا تو ہماری ادبی تاریخ عظمت و وسعت کے نئے اجالوں سے منور ہو جائے گی۔ تاہم جب تک نئی تحقیق کے نئے نتائج مرتب نہیں ہوتے اس وقت تک مخدوم شمس الدین ستید کو بہاولپور کا پہلا اردو شاعر ماننا پڑے گا۔ جو غالب ذوق اور ناسخ کے ہمعصر تھے۔ لیکن زبان و بیان کے اعتبار سے انھیں بہاولپور کا ولی دکنی کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ سرائیکی اور فارسی سے اثر پذیر اس سرزمین میں اردو شاعری کو مقبول بنانے کے لئے انھوں نے وہی بنیادی کردار ادا کیا۔ جو ولی دکنی نے دہلی میں ادا کیا تھا۔

ارمغان اوچ میں شامل اردو غزلوں کو اگر آج کی ترقی یافتہ غزل کے معیار پر کھا جائے تو ظاہر ہے کہ انھیں کوئی مقام نہیں دیا جا سکے گا۔ کیونکہ یہ غزلیں اس دور کی شاعری کا آئینہ ہیں جب داخلیت کی جگہ خارجیت اور معنی کی جگہ لفظ کی اہمیت تھی۔ لیکن ماضی کو حال کے پیمانوں سے ناپنے کا یہ رواج چل نکلا تو ہمارے قدیم شعراء کے بیشتر شعری اثاثے کو دریا برد کرنا ہوگا۔

منصفانہ تنقید کے لئے یہ بیحد ضروری ہے کہ ہر دور کے شعری اثاثے کو اس دور کے شعری معتقدات کی روشنی میں دیکھا جائے ورنہ ایک دور کی شاعری دوسرے دور کے لئے مہمل ہو کر رہ جائے گی۔ اور بقول الیگزینڈر پوپ یہ ایسا ہی ہوگا۔ جیسے کسی شخص کو جو ایک ملک میں کسی فعل کا ارتکاب کرے۔ کسی دوسرے ملک کے قانون کے تحت ماخوذ کر لیا جائے حالانکہ اس پر اپنے ہی ملک کا قانون عائد ہو سکتا ہے۔

جے وارٹن کے نزدیک بھی "یہ سراسر جہالت ہے کہ ارسطو یا اسپنسر کو ان تصورات کی روشنی میں پرکھا جائے۔ جن کی انھیں خبر بھی نہیں تھی۔ ہم تو ایسے زمانے میں رہتے ہیں جب ہر قسم کی تالیف و تصنیف کے اصول واضح اور متعین ہو چکے ہیں۔ اور ہم کوشش کرتے ہیں کہ ہماری تمام تحریریں تنقید کے رائج الوقت اصولوں پر پوری اتریں۔ لیکن ارسطو اور اسپنسر ایسے دور میں نہیں تھے۔ کہ ہر تصنیف کو کسی معیار کے پیش نظر مرتب کریں۔ اسپنسر کی شاعری اس کے گرم اور شدید قوت حاسہ کا آزادانہ اظہار ہے۔ اس کی لفظوں میں "واقعیت" کی مثال ویسی ہی

ہوتی ۔ جیسے کسی نادان معمار نے ایک قدیم طرز کی عمارت میں ایک جدید قسم کا کارنس داخل کردیا تھا۔

مخدوم شمس الدین ستید اس دَور کے شاعر ہیں جب غزل کے معنیٰ "بازی کردن ازجوانی و حدیثِ صحبت و عشق زناں" ہوتے تھے۔ اور بقول فراق "آپ بیتی و جگ بیتی کی بجائے شاعری لفظ بیتی ہوکر رہ گئی تھی"۔

ستید صاحب کی شاعری کا دَور دہلی اور لکھنؤ کے شاعرانہ کمال و زوال کا دَور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے ہاں دونوں رنگوں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں لیکن لکھنوی رنگ زیادہ چھایا ہوا ہے جس نے اُنھیں جذبات کی بجائے معاملات اور داخلیت کی بجائے خارجیت کا مظہر بنا دیا ہے۔

اس دَور میں طرزِ لکھنو سنگلاخ زمینوں، مشکل ردیفوں، صنائع و بدائع اور لفظی و ظاہری فن کی باریکیوں سے عبارت تھا جبکہ طرزِ دہلی غم پرستی، گداز، فکری بلندی، لہجے کی ملائمت، جذبے کی شدت اور زندگی کی حرارت کی علامت تھا۔

مخدوم صاحب کے ہاں یہ فرق بالکل واضح اور نمایاں ہے۔ ظاہر پرستی نے اُن کے شعروں کو دلفریبی کی جگہ نظر فریبی بخشی ہے۔ اور اُن کی شاعری کو من کی بجائے تن اور آہ کی بجائے واہ کی شاعری بنا دیا ہے۔ اس دَور کی ایک مقبول صنعت ایہام گوئی جو رعایت لفظی ہی کی ایک مشکل شکل تھی۔ مخدوم صاحب کے شعروں میں جگہ جگہ بہت نمایاں نظر آتی ہے۔ اس صنعت میں ولی کا مشہور شعر ہے ؂

نقطے پہ تیرے خال کے باندھا ہے جس نے دل ؛ وہ دائرے میں عشق کے ثابت قدم ہوا

مخدوم صاحب کی صنعت گری بھی دیکھئے :۔

کس طرح دامِ محبت سے چھٹے گا یہ دل
زلفِ پیچاں ہی گلوگیر ہے اللہ اللہ

مریضِ ہجر ہوں تشخیصِ نبض کیا ہے طبیبا
پلا دے وصل کی دارو یہی ہے میرا علاج

تیری فرقت میں اے گُلِ خنداں
بن گیا جسم خار کی صورت

مخدوم صاحب کے ہاں سیاسی و معاشرتی حقائق کے خدوخال کی تلاش عبث ہوگی کیونکہ وہ جس دور میں شعر کہہ رہے تھے وہ دہ بری محکومی کا دور تھا۔ اور انگریز اپنی سامراجیت کے استحکام کے لئے اظہار خیال کی آزادی کو کسی طرح برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم گل و بلبل کی علامتوں کے سہارے اس زمانے میں جو کچھ کہا گیا اگر اسے ۱۸۵۷ء کے سیاسی انقلاب پر منطبق کرنے کی کوشش کی جائے تو مخدوم صاحب کے ہاں بھی کچھ واضح شعر نکل آئیں گے۔

ادھر ہے دام بلا اور اُدھر ہے فصل بہار
نہ کیوں ہو لب پہ مرے نالۂ و فغاں صیاد

بہارِ فصلِ گل آئی ہیں کیونکہ دیکھوں چمن
یہ ڈر ہے ہو نہ کہیں گھات میں نہاں صیاد

عدو کے طالع ہیں بیدار میرے خوابیدہ
رہا مجھ سے کج پہ یہ آسماں افسوس

زخم پہ زخم دل پہ سہتے ہیں
اُف بھی کرتے نہیں ترے ڈر سے

اور اب ان کے مخصوص رنگ کے چند منتخب اشعار ملاحظہ کیجئے۔ جن سے آپ کو اُن کا شعری معیار متعین کرنے میں مدد ملے گی :۔

مشتاق ہیں صورت کے صورت ہی کو تکتے ہیں۔
سکتے کی سی حالت ہے کچھ کہہ نہیں سکتے ہیں۔

سینہ خوشی کے آنے کا اُمیدوار ہو
آبحیات مخفی ہے ظلماتِ غم کے بیچ

اب تلک یار نے احوال نہ جانا دل کا
دشمنِ جاں ہے یہاں سارا زمانہ دل کا

حال اچھا نہیں یوں سب کو سنانا دل کا
بھید رکھتے ہیں نہاں خلق سے دانا، دل کا

گرچہ وصل اس بت کافر کا نہایت ہے محال
لیک مرنے کو بھی کہتے ہیں یہاں لوگ وصال
یہ سرشکِ چشم دکھلاتے ہیں صد طوفانِ نوح
اس کی بارش سے کرے ہے ابرِ باراں الحفیظ
چلی جو بادِ خزاں گل پہ دیکھو بلبل سے
زباں ہے ایک کئے ہے فغاں ہزار شروع
عمر گذری ہے انتظاری میں
اب تو لازم ہے کچھ وفا کیجئے

زبان و بیان کی صنعت گری، تشبیہات و استعارات کی کشیدہ کاری اور فن کی جلوہ طرازی کے یہ نمونے سید صاحب کے دیوان میں نظر کی خیرگی کا موجب بنتے ہیں ــــ
یہ بات بُری طرح کھٹکتی ہے کہ غزلوں میں جگہ جگہ ناموزوں یا غلط اشعار درج ہیں جس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ یہ خط شکستہ میں لکھے ہوئے تھے۔ اس لئے صحیح طور پر نہ پڑھے جا سکے۔ بہر حال آئندہ اُن کی تصحیح کا اہتمام ضرور ہونا چاہیئے

ارمغانِ اُوچ میں اُردو کے علاوہ سید صاحب کا سرائیکی اور فارسی کلام بھی موجود ہے۔ جس سے اُن کی قادر الکلامی کا پتہ چلتا ہے لیکن چونکہ میرا موضوع صرف اُن کی اُردو شاعری تھا۔ اس لئے اس حصہ کلام پر تبصرہ نہیں ہو سکا۔ بہر حال اپنی بعض خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود ارمغانِ اوچ بہاولپور کے سرمایۂ ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ جس سے ماضی کا ایک گم گشتہ باب ہی نہیں کھلا حال و مستقبل کے لئے تحقیق و تصنیف کی نئی راہیں بھی کھلی ہیں۔

حرفِ آخر کے طور پر میں اس اہم ادبی دستاویز کی پیش کش پر جناب برگزیدہ نذیر علی شاہ کو ایک بار پھر ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں ؎

مسعود حسن شہاب

اوچ شریف

اسلامی تحریکات کا ایک قدیم علامتی مرکز

برصغیر ہند و پاک میں گنتی کے چند شہر ایسے بھی ہیں جن کو ہماری سیزدہ سالہ اسلامی تاریخ میں یہ اعزاز مقام حاصل ہے کہ وہ ایک شہر کے بجائے ایک تحریک کا علامتی مرکز قرار پاسکے ان شہروں کی تحریک قدامت سے قطع نظر ان آبادیوں میں ہمارے کچھ ایسے بزرگوں کے نقوشِ پا ثبت ہوئے جو نہ صرف اہم تاریخی شخصیتیں ہی نہ تھیں بلکہ وہ خود ایک تاریخ ساز ادارہ کی حیثیت اختیار کر گئے۔ اور گو مرورِ زمانہ کی دستبرد نے ان شہروں کے نقوش مٹا دیئے اور ان کی آبادیوں کو ویرانوں میں تبدیل کر دیا۔ تاہم ان بندگانِ حق نے ارشاد و حق کی جو شمعیں روشن کی تھیں ان کی تابانیوں سے ایک عالم منور ہو رہا ہے۔ اور ایک دنیا ان کی ضیا باریوں سے جگمگا رہی ہے۔

کسے کہ محرم بادِ صبا است می داند
کہ باوجود خزاں بوئے یاسمن باقی است

دہلی اور لاہور ہماری عظمتِ رفتہ کے بڑے پرانے امانت دار ہیں اور ان دونوں شہروں میں ہماری تاریخ ملی کے ایسے گنج ہائے گراں مایہ دفن ہوتے ہیں جن پر یہ دھرتی ہمیشہ ناز کرتی رہے گی۔ لیکن اس باب میں اولیت و قدامت کا شرف جس سرزمین کو حاصل ہو، کا خطہ ہے۔ یہی وہ علاقہ ہے جو پہلے پہل انسانی تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنا اور یہی وہ سرزمین ہے جو پہلے پہل مجاہدینِ اسلام کے قدموں کی جولانگاہ بنی۔ اور جسے یہ سعادت نصیب ہوئی۔ کہ اس کی مٹی میں کئی ایسے لوگ دفن ہوئے۔ جو اپنے وقت کے بڑے نامور عالم محدث، فقیہہ، ادیب، مؤرخ اور اہل نقل و کمال تھے۔ چونکہ سندھ کے علاقہ میں ہر ایک زمانہ میں ابتدا سے لے کر گجرات کا بھیلا اور ... پیدا ہوا تھا۔ یہ منصوبہ امتیاز اوچ کی

بستی کو حاصل ہوا کہ وہ برصغیر میں پیدا ہونے والی مختلف سیاسی، مذہبی اور روحانی تحریکات کا سرچشمہ بنا۔

اس برصغیر میں مسلمانوں کی پہلی خود مختار ریاست منصورہ کا قیام اس بستی کے ایک شخص عبدالعزیز بن منذر کے سیاسی تدبر کا نتیجہ تھا۔

پھر اس بستی کو اولیت کا یہ شرف بھی حاصل ہے۔ کہ اس برصغیر میں یہاں پہلی مذہبی اور روحانی درسگاہ قائم ہوئی اور چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر میں اوچ میں ایک ایسے دارالعلوم اور ایک ایسی خانقاہ کی بنیاد رکھی گئی، جو اپنی نوعیت کی پہلی مثالی درسگاہ تھی۔

افسوس کہ قرامطہ کے عروج نے تاریخ کے ان سنہری اوراق کو گم کر دیا ہے جو اس بستی کی علمی اور روحانی اہمیت کی داستان اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھے۔ تاہم آج بھی سید صفی الدین گازرونی (وفات ۳۹۸ھ) کا مزار اس کی علمی اور دینی عظمتِ رفتہ کا گہوارہ ہے۔

ملتان پر سلطان محمود غزنوی کے حملے کے بعد اوچ مسلمانوں کے ایک نیم مذہبی، نیم سیاسی فرقہ قرامطہ کی جائے پناہ اور دارالامان بن گیا۔ اور رفتہ رفتہ اس نے ایک بہت بڑے علمی و دینی مرکز کی حیثیت اختیار کر لی۔ سندھ کے مشہور قبیلہ سومرہ نے جو قرامطہ کی دعوت کو قبول کر چکا تھا اوچ کی سیاسی اور جغرافیائی حیثیت کی بنا پر اسے اپنا دارالحکومت مقرر کیا۔

محمود غزنوی نے قرامطہ کی سرکوبی کے لئے جس طرح ملتان کو تاخت و تاراج کیا، شہاب الدین غوری نے بھی اوچ کی حیثیت کو ختم کرنے کے لئے اس پر حملہ کیا کہ وہ اسلام دشمن قوتوں کی پناہ گاہ بن گیا تھا۔

شہاب الدین غوری نے اوچ سے قرامطہ کے اثرات کو ختم کر کے یہ علاقہ ملتان سمیت اپنے معتمد سپہ سالار علی کرماخ کے سپرد کر دیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد اس کی باگ ڈور ناصر الدین قباچہ کے ہاتھ آئی۔ جو شہاب الدین غوری کا معتمد غلام تھا۔

ناصر الدین قباچہ نے اوچ کو لاہور سے سندھ تک پھیلی ہوئی اپنی سلطنت کا پایۂ تخت بنا کر اس کی عظمت و رفعت کو چار چاند لگا دیئے۔ اس دور میں اوچ طور برصغیر کا ایک خوبصورت اور بہت بڑا شہر تھا جو وسعت، رقبہ اور شہرت کے اعتبار سے دہلی کا ہم پایہ بن گیا۔ اور دراصل یہی اس کے

عروج و ارتقاء کا وہ عہدِ زریں ہے جب اوچ نے اس برصغیر کی تاریخ سازی میں ایک نمایاں امتیاز
حاصل کیا۔ اور یہاں ایسے ایسے باکمال لوگ جمع ہوئے جو اپنے علم و فضل کے لحاظ اپنی گوناگوں خصوصیات
اور اپنی استعداد و قابلیت کی بنا پر ہندوستان گیر اثر و نفوذ کے حامل تھے۔

اس زمانہ میں رُوحانی مرکز کی حیثیت سے خانقاہ کازرونیہ اور تعلیمی لحاظ سے درسگاہ فیروزیہ
کی شہرت دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اوچ ہی کا فیض تھا کہ ہمیں ہندوستان میں عربوں کی آمد کے تاریخی
واقعات و حالات کا علم ہوا۔ "چچ نامہ" جو سندھ کے حالات پر پہلی مستند تاریخی کتاب ہے اس
کا مرتب جامع اوچ ہی کا باشندہ تھا۔ اور اسی سرزمین میں آسودہ خواب ہے۔ جامع الحکایات
اور لباب الالباب کا مصنف بھی اسی اوچ میں آ کر اقامت گزیں ہوا۔ اور یہیں اس نے اپنے علمی کارناموں
کو پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔

طبقاتِ ناصری کے مصنف منہاج سراج کو جو ہندوستان گیر شہرت حاصل ہوئی۔ اور اس کی علمی توجہات
اور دینی قدر و منزلت میں جو بیش از اضافہ کا باعث بھی وہ اوچ کے مدرسہ فیروزیہ سے اس کے تعلق
کی رہینِ منت تھی۔ اسی نسبت سے اُسے شمس الدین التمش کا معتمد بنایا اور اسی سبب سے وہ ناگور کا
قاضی القضاۃ مقرر ہوا اور بعد میں دہلی کی علمی مجلسوں اور رشد و ارشاد کی محفلوں کی زینت بنا۔ غرضیکہ
اوچ ایک ایسا مردم خیز خطہ تھا جس کی آغوش کتنے ہی نامور اہلِ علم و فضل کے لئے وا ہوئی۔ اور
کتنے ہی گمنام لوگوں کو اس نے اوجِ ثریا پر پہنچا دیا۔

مخدوم بہاؤ الدین ذکریا ملتانی کا خاندان بھی اسی سرزمین میں پھلا پھولا اور عروج تک پہنچا۔ خواجہ
فرید الدین گنج شکر نے اسی اوچ کی قدیم مسجد میں جو مسجد حاجات کے نام سے مشہور ہے ریاضت
و مجاہدہ کی مشق بہم پہنچائی۔ اور اسی مسجد میں ملحقہ کنوئیں میں نماز معکوس ادا فرمائی۔ اور یوں مقاماتِ
کے ابتدائی مراحل انھوں نے یہیں طے کئے۔

خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلی نے بھی اوچ کی اسی مسجد میں چلّہ کشی کی اور اعتکاف فرمایا۔
ہندوستان کا وہ خطہ جو سلاسلِ تصوف سے پہلے پہل روشناس ہوا۔ اور جہاں تصوف کا قدیم ترین
حلقہ قائم ہوا۔ وہ یہی اوچ تھا۔ جب چوتھی صدی میں بابا اسحٰق گازرونی کے بھانجے صفی الدین
گازرونی نے یہاں اقامت اختیار کی۔ ابنا بحر کے قدیم ترین سلاسلِ تصوف میں سلسلۂ گازرونیہ کا

شمار ہوتا ہے۔ گویا اس برصغیر میں تصوف کا آفتاب پہلے پہل اسی خطہ پر طلوع ہوا۔ اس کے بعد لاہور اور پھر اجمیر و دہلی کا نمبر آتا ہے۔

تصوف کے ایک اور خانوادہ حسینیہ بخاریہ سہروردیہ کا آغاز بھی اوچ ہی کی مردم خیزی کا ممنون ہے۔ اس خانوادے کے فیوض و برکات سے بعد میں پورے برصغیر نے استفادہ کیا اور ہند و بیرون ہند تک اس کے اثرات پہنچے۔

اس خانوادے کے گل سر سبد سید جلال الدین سرخ بخاریؒ تھے۔ جن کے دم قدم سے اوچ کو وہ سرفرازی نصیب ہوئی کہ صفحۂ گیتی پر ہمیشہ کے لئے اس کے نقوش اُجاگر ہو گئے اور پھر جو کچھ کمی باقی رہ گئی تھی اُسے مخدوم سید جلال سُرخ بخاری کے پوتے حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے اس طرح پورا کیا کہ دہلی اور گجرات کے سلاطین اس آستان کی خاک بوسی کو اپنے لئے عزت و شرف کا معیار قرار دینے لگے۔

اوچ میں حضرت سید جلال بخاری کی آمد ایک ایسے دور میں ہوئی جبکہ اوچ کے اطراف میں چولستان (روہی کا علاقہ) ہندوؤں کے قبضہ میں تھا۔ حضرت سید جلال بخاری نے اپنی روحانی قوت اور ایمان و عمل کی تاثیر سے اطراف و نواح کے بے شمار کو ... کو اسلام کا حلقہ بگوش بنا دیا۔ راجپوتوں کے متعدد قبائل آپ کی تبلیغی مساعی سے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ چولستان کے علاقہ کا ایک راجہ کھلو بھی حضرت ہی کے دست حق پرست مسلمان ہوا۔ حضرت مخدوم اور اُن کی اولاد کے طفیل تبلیغ دین اور ترویج اسلام کا سلسلہ صرف اوچ یا اس کے نواح تک ہی محدود نہیں رہا۔ بلکہ پورا برصغیر ہند ان کی روحانی و علمی ضیاء باریوں سے منور ہوا۔

خانوادہ حسینیہ۔ بخاریہ کے علاوہ جن سلسلۂ تصوف کے بزرگوں نے سرزمین اوچ کو اپنے قدوم میمنت سے نوازا اور ہندوستان میں دین حق کے فروغ کی مساعی جمیلہ انجام دیں۔ وہ خانوادہ گیلانیہ ہے۔ جس کے نامور بزرگ حضرت بندگی محمد غوث پہلے پہل (نویں صدی ہجری) اوچ میں تشریف لائے۔ آپ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی اولاد میں سے تھے۔ سلسلۂ قادریہ کو آپ کی ذات ستودہ صفات سے بڑا فروغ نصیب ہوا۔ اور بے شمار بندگان خدا نے آپ سے فیض روحانی پایا۔ سلطان حسین فرزند حاکم سندھ اور سلطان سکندر لودھی بھی آپ کے مرید تھے۔ حضرت

بندگی محمد غوث کے بعد ان کے فرزند ارجمند شیخ عبدالقادر جیلانی نے جو علم و عمل کے جامع اور کمالاتِ معنوی و ظاہری کے حامل تھے۔ تصوف کی دُنیا میں بڑا نام پیدا کیا۔

اوچ کی یہ قدیم اور نامور بستی سابقہ بہاولپور کا ایک اہم تاریخی مقام ہے۔ یہ بستی آج سے کم و بیش تین ہزار سال قبل ایک عظیم الشان شہر اور ایک زبردست تجارتی، فوجی اور سیاسی مرکز تھا۔

اوچ کا سرسری جائزہ لینے سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ نیرنگیٔ زمانہ کے ہاتھوں کئی بار یہ شہر اجڑا اور حادثات وقت کے تھپیڑوں نے بارہا اسے پامال کیا۔ مگر گردشِ ایام کے ہزاروں زخم کھانے کے باوجود بھی زمانہ اس کا نشان مٹانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

اوچ کی بستی کب بنائی گئی اور کون لوگ تھے جنھوں نے اُسے پہلے پہل آباد کیا۔ اس کے بارے میں وثوق کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔ تاہم اتنا یقین ہے کہ آریاؤں کی آمد سے قبل بھی یہاں ایک شہر آباد تھا۔ اوچ اور اس کے اطراف و جانب کے علاقوں میں آثارِ قدیمہ اب تک دستیاب ہوئے ہیں ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اوچ کی قدامت موہن جوڈارو اور ہڑپہ سے کسی طور کم نہیں ہے۔ اوچ ایک زمانہ میں "کوروؤں" کے راجہ دریودھن کی بہن رانی دُھلہ کا پایۂ تخت رہا۔ پھر اس راجہ کنند اور اس کے بیٹے آنند کی حکومت قائم ہوئی۔ مشہور فاتح اسکندر رومی نے اسے اپنی ترکتازیوں کا نشانہ بنایا۔ اور اس کی سرپرستی و شادابی کے تمنائی اشوکِ اعظم اور راجہ کنشکا نے بھی اس شہر پر اپنی خصوصی توجہات مبذول کیں۔ رائے خاندان کے عہدِ سلطنت میں اس کی حیثیت ایک اہم فوجی مرکز کی تھی اور یہ بڑا مضبوط قلعہ شمار ہوتا تھا۔ پھر چچ برہمن نے بڑی حکمتِ عملی سے اس پر اپنا قبضہ جما لیا۔ اور بالآخر اسلام کا نیرِ تاباں اس سرزمین پر ضوفگن ہوا۔

مختصر یہ کہ مختلف ادوار سے یہ بستی گذری۔ اور متعدد انقلابات سے دوچار ہوئی تاہم آج بھی اس کی عظمت ایک سنگین حقیقت ہے۔ اور اس کی یہ عظمت ان اہل اللہ اور اصحابِ دل کی رہینِ منت ہے۔ جنھوں نے اس ویرانہ کو بسایا۔ اور یہاں معرفتِ الٰہی کی جو جوت جگائی اس کی ضیا پاشیوں سے پورا عالم جگمگا رہا ہے۔

۵۸۶

علی احمد رفعت

جائزہ

بہاولپور کے بلند فکر ادیب و مصنف بریگیڈیر سید نذیر علی شاہ صاحب نے اوچ شریف کے گذشتہ صدی کے ایک صاحب علم بزرگ اور گدی نشین مخدوم الملک مخدوم سید شمس الدین خامس المتخلص بہ سیّد کے اُردو، فارسی اور سرائیکی کلام کا انتخاب زیر نظر مجموعہ کی صورت میں ترتیب دیا ہے۔ ان میں سے بیشتر اشعار (تقریباً) ایک سو سال قبل کہے گئے تھے۔ اس وقت سابق ریاست بہاولپور کی دفتری زبان فارسی تھی لیکن اردو بھی اہلِ علم اور عوام کے خواندہ طبقہ میں ترویج پا رہی تھی۔ علماً اور رُوحانی بزرگوں کا اُردو میں شعر کہنا اس امر کی دلیل ہے کہ یہ زبان اس وقت علمی اور ادبی حلقوں میں اظہارِ خیالات کا ذریعہ بن چکی تھی۔ یہ وہ دَور ہے جب دفاتر اور عدالتوں میں فارسی آہستہ آہستہ ترک کی جا رہی تھی اور اُردو اس کی جگہ لے رہی تھی جنوری ۱۸۶۶ء میں بہاولپور سے ہفت روزہ صادق الاخبار جاری ہُوا۔ اور صادق الانوار پریس قائم کیا گیا۔ یہ اس علاقہ میں اُردو کی ترویج و ترقی کا آغاز تھا۔ معلوم ہوتا ہے اس سے قبل بھی اُردو بھی اردو اہلِ علم کی محفلوں میں بار پا چکی تھی۔ اور پڑھے لکھے عوامی حلقوں میں تیزی سے پھیل رہی تھی۔

اس زمانہ میں بہاولپور جیسے دُور افتادہ خطہ میں کسی کا اُردو زبان میں شعر کہنا تعجب انگیز ہے۔ لیکن اُردو کی ہمہ گیری اور وسعت پذیری علاقائی حد بندیوں سے اس وقت بھی اسی طرح آزاد تھی جیسے اب ہے۔

اوچ ازمنۂ قدیم ہیں علوم و فنون کا مرکز رہا ہے۔ جب اسلام کی ضو باریوں سے یہ علاقہ فیض یاب ہُوا تو یہ اسلامی علوم اور روحانی سرچشموں کا مرکز بن گیا۔ تشنگانِ علم دُور دُور سے آکر اُن سرچشمہ ہائے علوم و فنون سے سیراب ہوتے تھے۔ اوچ کے گیلانی سادات میں بہت سے ایسے بزرگ ہو گذرے ہیں جنھوں نے اطراف و جوانب میں رشد و ہدایت اور علم و عرفان کی

روشنی پھیلائی۔ اُن کی تعلیمات، ملفوظات اور تصانیف کی صورت میں موجود ہیں لیکن خال خال ہی منظرِ عام پر آتی ہیں۔ ان میں سے بعض بزرگوں کی ادبی کاوشیں بھی مسودات کی صورت میں محفوظ ہیں، لیکن شائع نہیں ہو سکیں۔ یہ ادبی اور علمی تحریریں ادوارِ گذشتہ کے خیالات و رجحانات کی آئینہ دار ہیں۔ یہ بات اطمینان کا باعث ہے کہ اُن میں سے پہلا انتخاب شائع کیا جا رہا ہے۔

جہاں تک مخدوم الملک سید شمس الدین گیلانی خامس کی شاعری کا تعلق ہے اسے تغزل کے متعینہ معیار پر نہیں پرکھنا چاہیے جس دور میں انھوں نے زیرِ نظر اردو اشعار کہے وہ اُردو غزل کے عروج کا دور تھا۔ میر، غالب اور مومن سے بہتر تغزل اردو زبان کو کوئی شاعر نہیں دے سکا۔ لیکن اس زمانہ میں زبان و بیان کی خوبیاں دہلی اور لکھنؤ تک محدود تھیں۔ لاہور تک کو اُردو ادب کے علاقائی مرکز کی حیثیت حاصل نہ تھی۔ بہاولپور دور اُفتادہ علاقہ تھا۔ یہاں کے لوگوں کا اہلِ زبان سے براہِ راست رابطہ نہ تھا۔ وہ ابھی تک محاورہ اور روزمرہ سے واقف نہیں ہو پائے تھے۔ تاہم وہ غزل کے مزاج سے بے بہرہ نہیں تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ فارسی ادب کا سرمایہ بھی تغزل ہی کے گرانقدر شہپارے ہیں۔ اور اس علاقہ کے اہلِ علم فارسی ادب سے بھرپور استفادہ کرتے رہے تھے۔

سید شمس الدین خامس کے اُردو کلام میں تغزل کے غنائیہ پہلو بھی ہیں۔ اور تصوف کی جھلک بھی۔ عشق و وارفتگی کی علامات وہی ہیں۔ جو معاصر شعراء کے کلام میں پائی جاتی تھیں معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ اور دہلی بلند پایہ شعرا کا کلام اس علاقہ میں پہنچ چکا تھا۔ اور یہاں کے شعرا بھی اسی قسم کی تشبیہات و استعارات سے کام لینے لگے تھے۔ جنھیں مشاہیر شعرا استعمال کرتے تھے۔

سید صاحب کے کلام کا نمونہ دیکھئے:۔

سید خوشی کے آنے کا اُمیدوار ہو
آبِ حیات مخفی ہو ظلماتِ غم کے بیچ

مریضِ ہجر ہوں تشخیصِ نبض کیا ہے طبیب
پلا دے وصل کی دارو یہی ہے میرا علاج

سید موصوف کا فارسی کلام عام فہم ہے۔ نمونہ ملاحظہ فرمایئے:۔ ؎

شد حزن و یاس ہمدم و کار از رجا گذشت

بیروں ز حدِ حوصلہ جورد جفا گذشت

آپ کا سرائیکی کلام گوناگوں خوبیوں کا حامل ہے۔ اس زمانہ میں سرائیکی کے مشہور شاعر خواجہ غلام فرید کا طوطی بول رہا تھا۔ سید صاحب کی کافیاں بلند پایہ اور فکر انگیز ہیں۔ میں نے سید صاحب کے کلام کا اصل مسودہ دیکھا ہے۔ یہ مسودہ سید صاحب کا لکھا ہوا نہیں۔ مسودہ نویسوں کو لکھوایا گیا ہو گا۔ اوزان پر پورے نہیں اُترتے۔ ممکن ہے مسودہ نویس لکھتے وقت سہواً بعض الفاظ حذف کر گئے ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کلام پر نظر ثانی نہیں کی گئی ورنہ یہ سقم دور ہو جاتے۔ یہ بات بھی فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ موصوف کسی بڑے شاعر کے تلامذہ میں سے نہ تھے۔ انھوں نے اُردو میں شعر کہنے کی از خود کوشش کی تھی۔ البتہ سرائیکی کی کافیوں میں اوزان کا کوئی سقم نظر نہیں آتا۔

بریگیڈیر سید تدبیر علی شاہ صاحب کی کاوش قابلِ داد و تحسین ہے۔ انھوں نے اس علاقہ کے زمانہ ماضی کے اہلِ علم حضرات کے خیالات کو عوام تک پہنچا کر اس علاقہ کی اور اردو ادب کی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔

علی احمد رفعت

۲۰ر اکتوبر سنہ ۱۹۶۶ء

○

تعارف و المعارف

علامہ رحمت اللہ ارشد

خامہ فرسائی کی صلاحیت اور تیغ آزمائی کی استعداد کا رہیں ہمیشہ بُعد المشرقین رہا۔ تاریخ میں بہت کم حضرات کو یہ مجد و شرف حاصل ہوا کہ وہ بیک وقت صاحب القلم بھی ہوں اور صاحب السیف بھی۔ محترم بریگیڈیر نذیر علی شاہ صاحب اسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جنھیں بجا طور پر "صاحب السیف و القلم" کہا جاسکتا ہے۔

ممدوح کئی معرکۃ الآرا کتابوں کے مصنف۔ کئی کتابوں کے طابع و ناشر ہیں۔ اور بہت سے علمی دُور معاقہ و غیر معلقہ کو محفوظ کرنے کے ذوق سے سرشار ہیں۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ بہاولپور کی تاریخ محفوظ کرنے کے لئے بریگیڈیر صاحب نے جس دقت نظر، تعمق فکر اور ذہنی کاوش سے کام کیا وہ انھیں کا حصہ تھا۔ اگر وہ یہ عملی کارنامے انجام نہ دیتے تو شاید تاریخ کے بہت سے گوشے آج منصۂ شہود پر نہ آتے، اور پھر ہو سکتا ہے کہ مرورِ زمانہ تاریخ کی اِن حقیقتوں کے نقوش ہمیشہ کے لئے محو کر دیتا۔

اب اُن کا تازہ کارنامہ "ارمغان اوچ" اصحاب ذوق کی خدمت میں پیش ہو رہا ہے۔ اوچ کی تاریخی عظمت کا اندازہ کرنے کے لئے آج ہمیں تاریخ کے اوراقِ کہنہ اُلٹنے پڑتے ہیں۔ یہی اوچ جس کی حیثیت آج ایک قصبہ سے زیادہ نہیں، آج سے کئی صدیاں پیشتر علم و فکر، تہذیب و تمدن اور حضارت و مدنیت کا عظیم گہوارہ رہا ہے۔ ابن بطوطہ نے اپنے سیاحت نامہ میں اوچ کو پورے ایشیا کا سب سے بڑا شہر بتایا ہے۔ اور "طبقاتِ ناصریؒ" کے مصنف نے اپنی اس شہرہ آفاق تصنیف کو ایشیا کے اسی سب سے بڑے شہر میں مرتب کیا۔ طبقات کے مصنف قاضی ابوعمر منہاج الدین عثمان ابن سراج الدین الجوزجانی لکھتے ہیں کہ

"کاتب ایں حروف منہاج سراج از طرف خراسان از راہ غزنین و ملتان در کشتی روز سہ شنبہ لبست و ششم ماہ جمادی الاولیٰ سنہ اربع و عشرین و ستمائیہ، باوچ رسید و در ماہ ذی الحجہ سنہ اربع مدرسہ فیروزی اوچ حوالہ ایں داعی شد۔"
(طبقات ناصری صفحہ ۱۴۲ مطبوعہ کالج پریس کلکتہ ۱۸۶۴ء)

گویا مصنف ساتویں صدی ہجری کے ابتدائی رُبع میں اوچ میں وارد ہوئے۔ اور کچھ دنوں کے بعد فیروزی یونیورسٹی کے چانسلر متعین ہوئے۔ یہ یونیورسٹی علوم و فنون کے اعتبار سے کسی قدر ہمہ گیر اور عظیم تھی۔ اس کا اندازہ صرف اسی سے ہو سکتا ہے کہ اس یونیورسٹی میں دس ہزار طلبا ر اعلیٰ جماعتوں میں تعلیم و تربیت حاصل کرتے تھے۔ "طبقات ناصری" کے یہی مصنف ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ سلطان وقت کی تین لاکھ فوج اوچ کی حفاظت کے لئے متعین تھی۔ یونیورسٹی کی علمی مرکزیت اور فوجی چھاؤنی کی عظمت سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اوچ خدا کی بستی ہوئی زمین پر کس قدر جلیل القدر اور فقید المثال شہر تھا۔

آج تفصیل سے کون بتا سکتا ہے کہ اس شہر نے تمدن و حضارت کے کن کن شعبوں کو پروان چڑھایا، کتنے مُلکی انقلاب اس شہر کی تاریخ نے جنم دیئے۔ کتنے انقلاب یہاں برپا ہوئے۔ اور کتنے انقلابوں کے لئے یہ شہر وسیلہ بنا۔ قدامت تاریخ اور مرورِ زمانہ کا عملِ تحلیل اس شہر پر کچھ اس طرح سے اثر انداز ہوا کہ اب یہاں تاریخ کے طالب علم کے لئے وہ نشان تلاش کرنا بھی دشوار ہو گئے ہیں۔ جن سے وہ تحقیق و تجسس کے ذوق کی واجبات پوری کر سکتے۔

ہاں اوچ اسلام کی تبلیغ، رشد و ہدایت اور فقر و سلوک کی مرکزیت کے اعتبار سے جس معراجِ کمال کو پہنچا۔ اُن کے آثار مقدسہ اب بھی بخاری اور گیلانی سادات و مشائخ اور دیگر اصحاب کمال و عرفان کے مزارات کی صورت میں موجود ہیں۔

ان گذارشات سے اوچ کی تاریخ قلم بند کرنا مقصود نہیں بلکہ حضرات قارئین کی خدمت میں یہ پیش کرنا ہے۔ کہ "آثر مغانِ اوچ" کی سخن گوئی اور سخن وری اسی شہر کی باقیات الصالحات سے تعلق رکھتی ہے اس کے مصنف خانوادۂ سادات گیلانی کے ایک بزرگ ہیں۔ اس کتاب میں شاعر کا اردو زبان میں طبع آزمائی کے جواہر نایاب بھی جمع کئے گئے ہیں اور سرائیکی زبان کی دلاویز

دلفریب شاعری کے سوز و گداز کے مظاہر مصفا بھی موجود ہیں۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ سرائیکی زبان سندھ، بہاولپور، ملتان، مظفر گڑھ، ڈیرہ غازی خاں، ڈیرہ اسمٰعیل خاں، میانوالی کے وسیع علاقوں کی زبان ہے۔ اعداد و شمار کے پیش نظر صوبہ مغربی پاکستان کی اکثریت آبادی کی زبان ہے۔ بلاشبہ اس دیوان کے حصہ اردو میں قارئین کرام کو اردو کی موجودہ ارتقاء یافتہ اور ترقی پذیر زبان کی چاشنی کما حقہٗ نہیں مل سکے گی۔ لیکن تخیل کی بلندی، تشبیہ کی ندرت الفاظ کی بندش، ترکیب شعری کے لوازم اور سوز و ساز کی معنویت کی کمی محسوس نہ ہوگی اور کون نہیں جانتا کہ آج سے تقریباً ایک صدی پہلے اردو شاعری کی نشست و شکست کے دوائر آج کی شاعری کے نقوش سے بہت کچھ مختلف تھے۔ اس لئے اردو اشعار اسی قدیم ماحول کے آئینہ دار ہیں۔ اور ان اشعار کی معنویت اور دلآویزی سے لطف اندوز ہونے کے لئے اسی ماحول کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً شاعر لکھتے ہیں۔ ؎

یاد آتی ہے جب تری گفتار

سر ہے اور سنگ، یا در و دیوار

شعر میں تغزل بھی ہے اور بیان کی شگفتگی بھی۔ سادگی و پرکاری کے اعتبار سے بھی کچھ کمی نہیں مثلاً "گفتار کی یاد" سے سر، سنگ اور در و دیوار کو وابستہ کرنا عالم اضطراب کی شدت اور سنگینی بیان کرنے کے لئے کافی ہے مگر غالب نے:

سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

کہکر جس اندیشہ ہائے دور و دراز کی تعبیر و تذکرہ سے قاری کو متوجہ کیا ہے۔ وہ مخدوم صاحب کے شعر میں مفقود ہے مگر اس فقدان سے شعر کی رعنائی اور جاذبیت میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی۔

چونکہ مخدوم شمس الدین خامس فی الاصل اور بالذات مسند آرائے عرفان تھے۔ اور تصوف کے رسیا۔ اس لئے بعض اشعار میں تغزل کے ساتھ تصوف کے مضامین بھی ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ؎

اُگے گا چار طرف میرے لالہ و نرگس

یہ بعد مرگ بھی ہو گا مرے مزار سے عشق

تصوف کے مقامات میں توحید کا مقام نہایت ہی بلند ہے۔ اس لئے اسی غزل کے مقطع میں ارشاد ہوتا ہے :۔ سے

ولی و غوث و قطب کیا کریں بھلا سیّد !
ملے وہی جو ہو درگاہِ کردگار سے فیض

بہرحال اس مجموعہ کی اشاعت سے مقصد اس کلام کے جواہر محفوظ کرنا ہیں۔ جو امتداد زمانہ کے باعث بربادی کے قریب تھے۔ اس دیوان میں مخدوم صاحبؒ کے فارسی کلام کے انمول موتی بھی جمع ہیں۔ بلاشبہ شاعر کا فارسی کلام اُردو شاعری سے زیادہ زوردار ہے اور فارسی میں اُن کا اندازِ بیان اُستادانہ ہے۔ مثلاً فرماتے ہیں کہ :۔ سے

تا چند شوی غرّہ بایام حیاست
برخیز و بزن دست بہ ذیل حیات

یہ شعر اپنی ندرت بیان کے لحاظ سے ایک بے پناہ شعر ہے۔ اس شعر میں حیاتِ مستعار کی بے بضاعتی اور آخرت کے یقین و اذعان نیز زادِراہ کے لئے حسنات کے سرمایہ کی معنویت جس خوبی سے بیان کی گئی ہے۔ وہ یقیناً نادر ہے۔ غزل کا ایک اور شعر ملاحظہ فرماتے :۔ سے

افواجِ غم ز حصر و نہایت فزوں شدہ
زاں رایتِ شکیب و قرارم نگوں شدہ

"افواجِ غم" کے ساتھ "حصر" کا محاورہ اور "رایت" "نگوں شدہ" کی تشبیہ نے فنی اعتبار سے شعر کو آسمان تک پہنچا دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سیّد اصلاً فارسی اور سرائیکی زبان کے شاعر ہیں۔ آپ کی وفات کا سن تقریباً ۱۲۸۴ھ ہجری اور ۱۸۶۷ء عیسوی بنتا ہے (گویا ایک صدی پہلے) یہ وہ دور ہے جب سرائیکی زبان کی شاعری اوجِ کمال کو پہنچی ہوئی تھی یہی وجہ ہے کہ سرائیکی زبان میں حضرت سیّد کی قوت بیان پوری بے پناہی کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ سرائیکی میں تغزّل کا نمونہ ملاحظہ فرمایئے :۔ سے

نہ کیتو مُول ملاپ سائیں
ہے دِل رنجاون پاپ سائیں

تھی بے پرواہ ٹھلیندا ہیں
دھکیندا شوخ آلیندا ہیں
نہ ظلم کرن توں وینداہیں
تیڈے کھا گئے چھاپ سائیں

بہرحال اردو، فارسی اور سرائیکی زبان کے نادر و نایاب جواہر اس دیوان میں جمع ہیں۔ اور معلوم ہے کہ مقصد صرف اتنا ہے کہ بہاولپور کی سرزمین نے جو عبقری پیدا کئے اُن کے کمالات بحدِ امکان محفوظ کر لئے جائیں۔ یہ کوشش کس حد تک، کامیاب رہی۔ اس کا فیصلہ قارئین کرام خود فرمالیں۔

سید نذیر علی شاہ صاحب ہم سب کے لئے واجب الاحترام اور شکریہ کے مستحق ہیں۔ کہ اس پیرانہ سالی اور وسائل سے محرومی کے باوجود شب و روز اس تگ و دو میں فنا ہو چکے ہیں کہ اہلِ کمال کے مظاہرِ کمال محفوظ کر کے آئندہ نسلوں تک پہنچا دیئے جائیں۔ واللہ المستعان۔

ارشد

آزاد منزل بہاولپور
۸ راکتوبر ۱۹۶۶ء

○

اُردو کلام

"کُلُّ شَیءٍ یَرجِعُ اِلیٰ اَصلِہٖ" اُردو زبان کا وجود ۔ نام ۔ مقام پیدائش زیادہ تر دہلی لکھنو دکن کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے اور یہ فیصلہ کوئی غلط بھی نہیں ۔ ترکی زبان کے لفظ "اُردو" (معنی لشکر) کا اطلاق ہماری قومی زبان کے متعلق عملی صورت میں وادیٔ گنگا ہی میں صورت پذیر ہوتا واقعات کا تقاضا تھا ۔ برصغیر کے ابتدائی زمانہ کی اسلامی افواج میں افغانوں مغلوں کے علاوہ بھانت بھانت کی بولی بولنے والے مقامی باشندگان کتنے کس طرح اور کب شامل ہوتے شروع ہوئے ہوں گے ۔ "انڈین آرمی" یا "آرمی ان انڈیا" برطانوی عہد کی افواج ہند کے ارتقائی کے مطالعہ سے رومن اردو کا معرض وجود میں آنا ۔ افواج ہند کا بجائے انڈین آرمی کے آرمی ان انڈیا کہلانا رسم الخط رومن اردو کا عوامی حیثیت حاصل نہ کر سکنا ہیں ایک ہی مسلمانوں کے ابتدائی عہد کے برصغیر میں متوطن ہو جاتے والے مسلمان حکمرانوں کی وسعتِ نظر کا نتیجہ برصغیر کے مسلمانوں کی سب سے زیادہ بولی جانے والی قومی زبان کا اردو نام پانا ، پھلنا پھولنا ، دنیا کی عظیم زبانوں میں مقام حاصل کرنا ۔ تاریخ برصغیر ہی نہیں ، تاریخ عالم کا نہایت ہی دلچسپ واقعہ ہے ۔ لیکن اس سے بھی دلچسپ ترین واقعہ یہ ہوگا کہ ذرائع سفر کی سہولتوں کے پیش نظر آئندہ چند سالوں کے اندر اندر اردو میں عربی فارسی ترکی چینی ۔ روسی زبانوں کے الفاظ اصطلاحات و محاورات کے بکثرت شامل ہو جانے سے اردو عظیم دگر یعنی "ارد" اپنی قدرتی ساخت کی وجہ سے بتوسط پاکستان دنیا میں ایک وسیع تر علاقہ میں بولی جانے والی عالمی زبان بن جائے گی ۔

"ہر چیز اپنی ابتدا کی طرف لوٹ جاتی ہے" چنانچہ اردو اپنی دہلوی لکھنوی ۔ حیدرآبادی قمیص ملائیوں کے ساتھ مضافاتِ اوچ کی طرف لوٹ کر آ چکی ہے ۔ سلطان محمود غزنوی (گیارھویں صدی عیسوی سے) کے زمانہ سے دراصل اردو کہلانے کے بغیر اردو بننا شروع تھی

۔کوٹ وال، کوتوال، اور ہزاروں مخلوط الفاظ وادیٔ گنگا کی سرزمین میں مسلمانوں کے اقتدار کے پہنچنے سے پہلے وادیٔ سندھ کے اس علاقے میں جس کے مرکز اوچ اور ملتان ہیں رائج ہو چکے تھے۔ مالکِ کائنات قادرِ مطلق زبان کی تخلیق کے سلسلہ میں جس حکمت سے کام لیتے ہیں۔ اُن کی اس حکمت کے سلسلہ میں اوچ نے کیا خدمات انجام دی ہیں کا پتہ لگانا بڑے گہرے مطالعہ کی ضرورت ہے۔

مخدوم الملک صاحب کا اردو کلام اردو کی ارتقائی منازل میں ایک واضح نشان راہ ہے۔

○

بسم اللہ الرحمٰن الرحیمؔ

○

یہ تیرے عشق کی تاثیر ہے اللہ اللہ
رات بھر نالۂ شبگیر ہے اللہ اللہ
جاں طبیب آئی آنے کا نہیں اس کو خیال
سنگ دل وہ بت بے پیر ہے اللہ اللہ
کس طرح دام محبت سے چھٹے گا یہ دل
زلف پیچاں ہی گلو گیر ہے اللہ اللہ
جان کنی سیکڑوں کرتے ہیں مثل فرہاد
کیا ہی شیریں تیری تقریر ہے اللہ اللہ
روز محشر کا تجھے خوف ہے کیا اے سیدؔ
حامئ دیں تیرا شبیر ہے اللہ اللہ

○

اے جناب کبریا میری یہی ہے التجا
پنجتن کے واسطے میری بر آوے مدعا
پنج ہیں معروض میرے ہوں وہ حیطۂ قبول
اولاً ایمان کامل دوئمی ہووے شفا
طول عمری سے رہے اولاد میری شادکام
اور حاسد سے نہ پہنچے ان کی مجھ کو کچھ اذا
آبرو جگ توں رہے بلکہ الٰہی ایسا ہو
میں نہ ہوؤں منفعل نیکوں سے دارِ جزا

O

مہر دکھتا نہیں کچھ وہ مہ تاباں میرا

وحشتِ دل نے کیا حال پریشاں میرا

خوں فشاں ہجر میں ہے دیدۂ گریاں میرا

لعل و گوہر سے بھرا رہتا ہے دامن میرا

تری کھوں میں غرقت کیا گلِ خنداں تجھ بن

سینہ داغوں سے ہوا رشکِ گلستاں میرا

چشمِ مست دکھا کر گیا جب سے وہ شوخ

وا سدا رہتا ہے یہ دیدۂ گریاں میرا

حال سید کا زبانی یہ ہے کہیو اے شوخ

دیکھ دامن تلک آ چاک گریباں میرا

O

چھیدا دل میرا خدنگِ نگہِ جادو نے

پیچ مارے مرے دل پہ خمِ گیسو نے

○

سیدا کھیل نہیں سہل لگانا دل کا
طول رکھتا ہے بہت فسانا دل کا
اب تلک یار نے احوال نہ جانا دل کا
دشمن جان ہے یہاں سارا زمانا دل کا
حال اچھا نہیں یوں سب کو سنانا دل کا
بھید رکھتے ہیں خلق سے دانا دل کا
دکھ تو امید قوی فضل خدا سے ہر حال
کہ سیدا ہو گا تجھے یاد ملے اے صل وصال
(تمت بالخیر تاریخ ۲ جمادی الاول ۱۲۸۷ھ مقدس)

○

وہاں تو گلچیں ہے بہار رخ دلبر رقیب
یہاں پڑا میں ہوں تپ ہجر سے مرنے کے قریب
ہاتھ دھو بیٹھے ہیں نبض لیت میرے یہ طبیب
غم یہ میرے ہے جو ہنستا ہے وہ دلدار عجیب
سو کے پھر جاگیں بھلا ایسے کہاں میرے نصیب
ہاتھ کب میرے حمائل ہوں در آغوش حبیب
گوشۂ غم سے بغل میں میرے صد پارۂ دل
پھوٹ کر آنکھوں سے بہا ہے یہ ناسور دل

کہوں میں کس سے یہ کہ ہے زندگی بہ رنگ حباب
خدا کے واسطے او بت اُلٹ تو رخ سے نقاب

کیا ہے قتل تو مجھ کو نہ نیم بسمل چھوڑ
دمِ اخیر ہے قاتل مجھے تو کر سیراب

حیران ہے موسمِ گل گوشہ چمن بے نصیب
پلا دے وصل کی دارو نہیں یہ وقت حجاب

ہے آہ بستر فرقت پہ میری ہم بستر
ہوا ہے نالہ شبگیر بزمِ غم کا رباب

پڑھا ہے درسِ محبت کا جب سے ہم نے سبق
مدام آٹھ پہر دو بر و ہے غم کی کتاب

چمن ہو چاندنی ہو چار سُو ہو آبِ رواں
بغل میں یار ہو کھاریں شراب ساتھ کباب

ہیں دو جہاں میں مددگار پنج تن شیدؔ
قرار کر دلِ مضطر نہ ڈر زِ روز حساب

مجھ کو کر دکھلا دیار کی صورت
دل ہے مضطر قرار کی صورت

ہیں دلبر نہ ہو کرو انصاف
کس طرح ہو قرار کی صورت

مے ہو گلشن ہو اور ساقی ہو
تب خوش آئے بہار کی صورت
کئے غائب مجھے خلق سینکڑے دل گل
بے مثل ہے نگار کی صورت
سوزِ فرقت سے سینہ میں یہ دل
بن گیا ہے شرار کی صورت
نہیں آیا نظر ترا ثانی
گرچہ دیکھی ہزار کی صورت
تیری فرقت میں اے گلِ خندان
بن گیا جسم خار کی صورت
وہ نہ آیا تو کھل گئے مجھ پر
صاف ظاہر غبار کی صورت
سُن کے آمد تیری ہوا سید
عمر بھر انتظار کی صورت

جاتی ہے عمر ہجر میں اے یار الغیاث
تڑپے ہے رات دن یہ دلِ زار الغیاث
ہے ہے کسے سناؤں میں حالِ دلِ خراب
جاں بر نہ ہو گا ہجر کا بیمار الغیاث
بے ڈھب پھنسا دل ہے خمِ زلفِ دوتا میں حیف
چھوٹے نہ عمر تک یہ گرفتار الغیاث
وہ حالِ زار ہے کہ مسیحا بھی دیکھ کے
کہتا ہے الاماں در و دیوار الغیاث

میں تڑپوں اور غیروں ہیں خنداں ہو مثلِ گل
دل میں کھٹک تو رہا ہے یہ بھی خار الغیاث
ناصح خموش تجھ سا ہے ناداں جہاں میں کون
ملنے سے یار کے کروں انکار الغیاث
تپ میں آہ، دل میں فغاں لب پہ ہر گھڑی
سیّد ہے ایسی زیست سے بیزار الغیاث

○

کروں میں خاک بھلا سیرِ بوستانِ صیّاد
ہے دل پہ رشکِ ارم داغ گلسرِ خانِ صیّاد
کیا ہے آج وعدہ کہ کل کروں آزاد
ہزار شکر ہوا مجھ پہ مہربان صیّاد
بہار فصلِ گل آئی کیونکہ دیکھوں چمن
یہ ڈر ہے ہو نہ کہیں گھات میں نہاں صیّاد
ہے شکر دام سین چھوٹے پہ کیا کہوں اے یار
ہزار حیف نہ گل کا رہا نشانِ صیو
اِدھر ہے دام بلا اور اِدھر ہے فصلِ بہار
نہ کیوں ہو لب پہ میرے نالہ و فغاں صیّاد
خزاں بھی ہو گئی فصلِ بہار اے سیّد
نہ لایا نام رہائی کا بہ زبانِ صیّاد

○

گرچہ وصلِ بُتِ کافر کا نہایت ہے محال
لیک مرنے کو بھی کہتے ہیں میاں لوگ وصال

○

ملے جو یوسفِ ثانی شبِ فراق میں آج
بیامِ وصل گویا مجھ کو ہو گئی معراج
مریضِ ہجر ہوں تشخیص نبض کیا ہے طبیب
پلا شربتِ وصل کی دارو یہی ہے میرا علاج
ہیں داغ دل میں جگر میں ہزار ہیں سوراخ
دیارِ عشق سے حاصل ہوا یہ مجھ کو خراج
لگا تو تیر نگہ بے شبہ کمانِ ابرو
سپر ہے سینہ یہ دل اور جگر میرا آماج
نہیں ہے خواہش حور و نعیم سیّد کو
ہے خاکِ یار کے کوچہ کی بستر و دیباج

○

بازار اس جہاں سے جو چاہو خرید لو
رخصت عمل نہیں ہے دوکان عدم کے بیچ
مُردوں کو معجزہ ہے اٹھانا مزار سے
نامِ علی تھا درج مسیحا کے دم کے بیچ

حرفاً بحرف اس کی زباں پر ہے آشکار
پوشیدہ ہے جو سینۂ لوح و قلم کے بیچ
سیّد خوشی کے آنے کا اُمیدوار ہو
آبحیات مخفی ہے ظلمات غم کے بیچ

○

ہے بسکہ زخم دل پہ نمک مہرباں لذیذ
اور ہے شب فراق میں شور و فغاں لذیذ
ایک بوسہ مجھ کو اُس لب جاں بخش سے ملا
تا مرگ رہ گیا مرا کام و زباں لذیذ
ناداں تھا قیس آپ کو رسوا عبث کیا
ہوتا ہے بسکہ ہمدموں زخم نہاں لذیذ
چھڑکا نمک یہ سوز محبت نے بعد مرگ
کہا کہ کہے ہما کہ یہ ہیں استخواں لذیذ
حوروں کو چھوڑ چاہ ذقن میں غریق ہوں
آ کو فرشتہ دیکھے ہے مہر تاباں لذیذ
سید تو کیا غلام مسیحا و خضر ہوں
تقریر ایسی کیا کرتا ہے وہ دلستانِ لذیذ

○

یاد آتی ہے جب تری گفتار
سر ہے اور سنگ یا در و دیوار
زلفِ مشکیں سے دل بچے کیونکر
ہے یہ مار سیہ بلا خونخوار
تری فرقت میں اے گلِ خنداں
شور و فریاد ہے بہ رنگِ ہزار
زور و زر کچھ نہیں جو وہ آوے
نقد دل تھا سو کر چکے ہیں نثار

بعد مردن بھی بس یہ حسرت ہے
کوئے دلدار میں بنا دیں مزار
آہ ہمدم ہے اور نالہ رفیق
بس یہ ہیں دو میرے ۔ ۔ ۔ غمخوار
حالِ سید نہ پوچھ اے ناصح
چشمِ جاناں نے کر دیا بیمار

○

رہا ہمیشہ میرے دل کو میری جاں افسوس
ہوئے کبھی نہ آ کے میرے مہماں افسوس
اٹھائے چشم نے طوفاں بجھی نہ سوزشِ دل
جلایا آتشِ فرقت نے خانماں افسوس
عدو کے طالع ہیں بیدار مرے خبیدہ
رہا مجھی سے کجی پر یہ آسماں افسوس
ہوا نثار جہاں تک دکھایا حالِ تباہ
رہا وہ عدو سے فزوں مجھ سے بدگماں افسوس
رہا میں کنجِ قفس میں وائے نصیب
بہار فصلِ گل آتے ہوئی خزاں افسوس
کٹے بن اس کے کہاں تک تو ہی بتا سید
نہ ہے کیونکہ زباں پر میری فغاں افسوس

○

اٹھے ہے فصلِ بہاراں میں زخمِ دل میں خراش
رہے ہے کوچۂ گلرو کی بسکہ مجھ کو تلاش

تیری یہ چیں بہ جبیں و کرشمہ میرا نیاز
ہزار مرتبہ چاہے نہ لکھ سکے نقاش

رہو رقیبوں سے تم خوش تو ہے سلام مرا
نہ دیکھیو تو قاصد یہ اس سے جا کر فاش

تیرے خیال میں او بُت میں دو جہاں سے گیا
رہے نہ معاد نہ حاصل نہ دیکھا روئے معاش

طپش ہے دل میں تیرے سوزِ ہجر سے سیّد
کہے طبیب تو پی گر ملی ہے وصل کی آش

ہوا نہ اُن پہ اثر میں پڑھیں ہزار اخلاص
خدا ہی ہے جو کرے مجھ سے وہ نگار اخلاص

نہ درد دل تھا نہ سوزِ جگر نہ وا چشم تری
دکھائے ہائے یہ لاکھوں ہے انتظار اخلاص

جلایا خانۂ ہستی کو تب ہوا معلوم
فزوں ہے آتش دوزخ سے ایک شرارِ اخلاص

ہے سر سے تا بقدم داغ رشک صد گلشن
دکھائے فصلِ بہاری میں یہ بہارِ اخلاص

برنگ بلبل بیدل کرے ہے سیّد شور
ہزار حیف نہیں تجھ میں گلعذار اخلاص

ہو جتنا خلق کو اس ابر نو بہار سے فیض
فزوں ہے اس سے مری چشم اشکبار سے فیض

بنا ہے جامۂ تن میرا غیرت گلعذار
ملا ہے جب سے یہ اس یار گلعذار سے فیض

ہوں بسکہ سر سے قدم تک میں نرگس حیراں
دیا ہے وعدۂ گلرو نے انتظار سے فیض

ہیں میرے کلبۂ غمزداں میں رنج و غم مشفق
ہوا ہے مجھ کو یہ سرکار عشق یار سے فیض

اُگے گا چار طرف میرے لالہ و نرگس
کہ ہوگا بعد مرگ یہ میرے مزار سے فیض

لگایا نقشہ کو چھاتی سے پر نہ ہوئی تسکین
کہیں بھی ہوتا ہے کچھ نقش اور نگار سے فیض

ولی و غوث و قطب کیا کریں بھلا سیّد
ملے سو ہی جو ہو درگاہ کردگار سے فیض

کرے ہے روز عید کو شاہ و گدا نشاط
وصل صنم جو ہو تو مجھے ہے صدا نشاط

حور و نعیم بھی جو ملے تو ملے پر یار
لیکن ملے وہ یار تو یہ ہے جدا نشاط

یا اس کو یہاں لے آؤ یا مجھ کو ہی لے چلو
ناصح کسی طرح سے غرض مدعا نشاط

خونِ جگر تھی یا دمِ حلق شہدائے
سو رنگ سے دکھائے ہے رنگِ حنا نشاط

خنجر پھرا گلے پہ میں قربان مجھے ہے عید
کرتا ہے میرے قتل پہ وہ دلربا نشاط

ہر صبح و شام ہی یہ ہے پیغام لا دے جلد
اس گلبدن کی بُو جو ہے مجھ کو حنا نشاط

سیّد کو دے گا ساقیٔ کوثر بروزِ حشر
ایک جام اپنے ہاتھ سے اور مصطفا نشاط

○

یہی ہے یہ ناگ پدم وہ زلفِ پیچاں الحفیظ
دو زُبانہ مار ہے ہر لحظہ گویاں الحفیظ

یہ سرِ فلک چشم دکھلاتے ہیں صد طوفانِ نوح
اس کی بارش سے کرے ہے ابر باراں الحفیظ

چشم جادو ہے غضب رہزن جو رہزن مارلے
تیر مژگاں سے کرے شیر نیستاں الحفیظ

ہے نہاں وہ آہ آتش بار سینہ میں میرے
کھچتی ہے جس کے آگے برقِ سوزاں الحفیظ

کس طرح جاں بر ہو سیّد بس مریضِ عشق ہے
رات دن رہتا ہے لب پر شور افغاں الحفیظ

○

ہوا ہے سبزہ خطِ رُخ پہ گلعذار شروع
بخطِ ریحاں رقم کیجئے یہ بہار شروع
چلی جو بادِ خزاں گل پہ دیکھو بلبل نے
زباں ہے ایک کئے ہے فغاں ہزار شروع
فغاں ہے آہ ہے سوزِ جگر ہے چشم ہے تر
ہوا ہے نخل تمنا میں برگ و بار شروع
ہزار طائرِ جاں کو بکو تڑپتے ہیں
کیا ہے ان دنوں قاتل نے کیا شکار شروع
کسی کو مار چلایا کسی کو قتل کیے
کیا ہے اس بتِ بے پیر نے یہ کار شروع
میں جانتا ہوں اس سنگدل کو بعد میرے
کرے گا اقتلو اگر سر مزار شروع
ہو خاک فائدہ سید کرو مسیحا دم
دمِ اخیر کیا تو نے آ کے پیار شروع

شعر

کیوں نہ جانوں کہ اہلِ ایماں ہوں
منہ تیرا یار میرا قرآں ہے
معشوقانِ جہاں سے نہیں مجھ کو کچھ غرض
اس کی جو میرے سامنے تصویر پھر گئی

○

خوں فشاں آنکھ ہے، ناسور اسے کہتے ہیں
سینہ پر آگ ہے تنور اسے کہتے ہیں
ناتواں وہ ہوں کہ رنجور اسے کہتے ہیں
تن پہ وہ بار ہے مزدور اسے کہتے ہیں
دلنشیں غم ہے جس پہ معمور اسے کہتے ہیں
وصل ممکن نہیں مہجور اسے کہتے ہیں
رخ مقصود نہ دیکھا کبھی بیداری میں
نیند کافور ہے یہاں ہجر کی بیماری میں

○

ہے غضب ہر گھڑی جفا ہی کرو
کبھی تو رحم بھی کیا ہی کرو
مجھ سے در پردہ غیر سے ملنا
تم کو لائق نہیں حیا ہی کرو
روز کے وعدہ سب ہوئے ہیں خلاف
ایک وعدہ تو اب وفا ہی کرو
یا تو غیروں کا ہو یا ہو میرا
آج قصہ یہ فیصلہ ہی کرو
ہوں فدا کل جو کی ادا تم نے
پھر حق آج وہ ادا ہی کرو

التجا کی تو یوں لگے کہنے
کون کہتا ہے التجا ہی کرو
میں وفا سے تو منہ نہ موڑوں گا
جتنا دل چاہے تم جفا ہی کرو
ہر گھڑی زخم پہ نمک چھڑکو
کبھی تو زخم دل سیا ہی کرو
یا مجھے لے چلو یا وہ آوے
ہمدمو کچھ میری دوا ہی کرو
ان دنوں کچھ نہ پوچھو دل کا حال
حال بے حال ہے دعا ہی کرو
ظلم سید غریب پر کرنا اے بتو تم ۔ تم خدا خدا ہی کرو

○

نشۂ حکامی سے جو کہ سرشار ہو گیا
جانو یقیں کہ یاروں سے اغیار ہو گیا
اُلٹے ہوئے نصیب کہ دیکھو اُلٹ پلٹ
اقرار کل جو کرتا تھا انکار ہو گیا

○

محمل لیلیٰ کجا مجنوں کی صحرا کجا
دیکھنا تقدیر کو مجھے راہ پر بھلا گئے

شورشِ جنوں کی پھر جو اب ابتدا ہوئی
اشکوں کے سیلِ عمدی زباں پہ صدا ہوئی
محفل ہیں کوچہ ہا میں تیرے قیل و قال ہے
حمیت فتنے لڑ کے کھیلیں ہے میری بلا ہوئی
توقیر کا کیا ڈھنگ ہے ناموس کا کیا رنگ
جو آبرو کہ ملتی نہ تھی جا بجا ہوئی
تسلیم کرنے میرے سے ہوتی ہے بس خفا
وہ نازنیں میری جو نازک ادا ہوئی
روزِ الست میں دیکھو سید جو جان تیری
شاید کہ اُس کے پاؤں پہ دل سے ندا ہوئی

ہیں سوا ابر سے یہ دیدۂ گریاں بھرے
اسقدر ہجر میں روتے کہ بیاباں بھرے
برق روپوش ہوئی رعد بھی خاموش ہوئے
آہ نالہ یہ تیرے ہجر میں اے جان بھرے
لالہ شرمندہ ہو دیکھے جو میرے داغِ جگر
اشکِ خونی سے صدا رہتے ہیں مژگاں بھرے
کیا بیاں ہو تیری بیداد کا ہر زخم میں آہ
کہیں نشتر کہیں خنجر کہیں پیکاں بھرے
تیر باراں ہے میرے واسطے یہ ابرِ بہار
دل میں سید کے ہزاروں ہیں ارماں بھرے

○

جب سے دلبر گیا ہے میرے بر سے
اشکِ خوں چشم سے سدا برسے
ہو رقیبوں کے بر میں دلبر حیف
ایک بوسہ کو ہم سدا ترسے
دردِ دل سے تیری جدائی میں
نہ تھمیں اشک دیدۂ تر سے
مجھ سے برگشتہ بخت کون ہے آج
پھر گیا آ کے وہ میرے در سے
دل میں سودائی زلفِ یار رہا
نہ ٹلی یہ بلا میرے سر سے
زخم پر زخم دل پہ سہتے ہیں
اوف بھی کرتے نہیں تیرے ڈر سے
دولتِ دو جہاں ہے وصل صنم
نہیں شیدا کو ذوق کچھ زر سے

○

درد ہے تو کچھ دوا کیجیے
جی ہے بیچیں پھر کیا کیجیے
نہیں آتی اگر وفا کی روش
جور کے طرز سب ادا کیجیے

بسترِ غم پہ میں تڑپتا ہوں
نامۂ شوق تو لکھا کیجئے
عمر گذری ہے انتظاری میں
اب تو لازم ہے کچھ وفا کیجئے
حال سیّد کا کہو اے قاصد
اس کا حاصل تو مُدعا کیجئے

O

جو اشارہ کی مجھے عنایت ہے
منہ سے بولا نہ کچھ حکایت ہے
عاشقوں کے لئے تو اے دلبر
مُسکرانا تو بس کفایت ہے
پیکِ مژگاں سے دل کا خون لینا
غمزہ رہزن کی یہ ہدایت ہے
حسن کے دن میں جو کہ رات ہوئی
زلفِ مشکیں کی یہ شکایت ہے
میری اب عوز کو وہی پہنچے
سیّدا جو کہ شاہِ ولایت ہے

O

اشک سے چشم ہوئی گلابی ہے
دل کو آہوں سے اضطرابی ہے
چاندنی مون بغیر تیرے صنم
مجھ لئے سراسر خرابی ہے

انتظاری میں دل پھڑپھڑک سے رہا
قاصد آیا نہ کوئی جوابی ہے
چاند سورج تیرے نثار کئے
سیم و زر کی بھری رکابی ہے
جلد ستید کو مل تو بہر خدا
اس زمانہ کو انقلابی ہے

فارسی کلام

آج سے ایک سو سال پہلے ۱۸۶۶ء میں لاہور میں بولی جانے والی زبان اتنی اور ایسی اردو یہ تھی اور نہ ہی اتنی اور ایسی فارسی تھی جتنی کہ آج لاہور والے لکھتے پڑھتے بولتے ہیں۔

جب لاہور میں لکھی پڑھی بولی جانے والی زبان کا یہ حال جو آج سے ایک سو سال پہلے نہ تھا۔ تو پشاور۔ دہلی کی شاہراہ سے ایک طرف ہٹ کر واقع شہر و اصلاع ملتان کے رہنے والے دفتری سرکاری زبان کیلئے فارسی زبان کا زیادہ تر سہارا لیتے قدرتی بات تھی۔

اس سلسلہ میں غالباً یہ بات تعجب خیز معلوم ہوگی کہ بجائے ملانوں کے دفتری دنیا پر قبضہ ہونے کی۔ جبکہ اس زمانہ میں مسلمانوں کی نسبت ہندو فارسی خواں۔ فارسی دانوں کی تعداد زیادہ تھی۔ لیکن از روئے واقعات یہ بات تعجب خیز نہیں، وہ اس لئے کہ اس علاقہ پر انگریز کے اقتدار کے جمنے سے پہلے اس علاقہ کے مسلمان دکان کرنا دفتری نوکری کرنا اپنے خاندان کی ہتک سمجھتے تھے۔ پڑھے لکھے مسلمان زادوں کے لئے یہ تلخ ترین امتحان ہوتا تھا کہ وہ تو مسیتڑ ہے یعنی مسیت (مسجد) میں رہنے بیٹھنے والا بزدل قسم کی شخصیت ہے۔ جسے ہمت اور حریت سے کوئی لگاؤ نہیں۔

بایں ہمہ فارسی لکھنے والے مسلمان بھی بعض ایسے صاحب کمال اس زمانہ میں موجود تھے کہ جن کی فارسی تحریر فیضی، عراقی عاقل خانی رنگ ڈھنگ کی تھی۔ اسلامی ادب کی بے شمار داستانیں وادئ سندھ کے اس علاقہ میں بعض موجود، بعض معدوم ایسی ہیں کہ جنہیں قومی دولت کے طور پر برآمد کر کے سمیٹا سجایا اپنایا جائے۔ کافی محنت کافی شوق کافی سرمایہ کی ضرورت ہے۔ مخدوم الملک کا فارسی کلام کس حد تک اس کارِ خیر میں خضرِ راہ ثابت ہو سکتا ہے قوم کے ارادہ پر منحصر ہے ۔۔

تا چند در شوی غنوده بایام حیات

برخیز و بزن دست بذیل حسنات

آں شمسهٔ پیش طاق ایوان کرم

مخدوم جهاں شمس سپهر درجات

از خنده گه زدن فشاند گهرے

ز انفاس گه سخن بریزد برکات

بالش گه ناز او مورد نیاز

خلوت گه خاص او بمحبوبیت ذات

در ازمنهٔ ممدوح باوصاف جمیل

بر السنه مذکور بحسن عادات

آں آئنده اولاد امام معصوم

فخر فقرا و مقتدای سادات

از لغزش پائے در خلاوت دنیا

باز داشته نگهه او مقیل العثرات

ایں مسجد پر زیب ازاں کرده بنا

خوشنود شود تا که مجیب الدعوات

[illegible] منتظری که سال مسجد چوں است

در ساعت نیک و بهترین اوقات

ز روزن جشن غیب بلال ہاتف

آواز برآورد که خنجر بنجات

۱۲۹۸ھ

○

یارب چہ شد کہ یارب من از سما گذشت
ناموس دل ز مرہم و درد از دوا گذشت
شد حزن و یاس ہمدم و کار از رجا گذشت
بیرون ز حد حوصلہ جور و جفا گذشت
از جور چرخ شعلہ بجانم چہا گذشت
ہر کس کہ دید حال من انگشت خا گذشت
خونابۂ جگر ز دو چشم رواں شد است
چوں شمع وقت شعلہ بتن استخواں شد است

○

یارب چہ شد کہ یارب من از اثر گذشت
جانم ز تن ملال اندیشۂ شکم ز حسر گذشت
دوزخ چہا بجانم ازیں چشم تر گذشت
دریاے موج گریہ ام از خشک و تر گذشت
شب از نہار روز من از شب تر گذشت
چوں طفل اشک عمر من اندر سفر گذشت
ہر دم ز جوش حسرت و غم گریہ سر کنم
تا لو بتا را اشک ستارا اثر کنم

○

افسوس کز گزیدنِ آں زلفِ ماروار
جان است زار و دل تپہ و دیدہ اشکبار
از جوشِ درد گشتہ بچشمم زمانہ تار
صد نیش می زند بمن ایں مارِ زہردار
از درد و رنج و فرقت و اندوہ انتظار
آمد شدِ نفس بتنِ زار گشتہ تار
گویا نفس زدن دمِ اژدر گزیدن است
رنگِ زخم چو پرِ گل اندر پریدن است

تا ناوکِ نگاہ بجانم شدہ دوچار
شد سینہ ام مشبک ازیں تیرِ آبدار
از فرطِ درد نیست عجیب آنکہ در مزار
دل در برم چو شعلہ طپید از فراقِ یار
بل گردد ار بماند دل اینگونہ بے قرار
چوں شعلہ موجزن ز لبِ خاکِ من غبار
آغوشِ گور شق کند ایں برقِ شعلہ ریز
قائم کنند معاملہ روزِ رستخیز

○

از دستبرد الفت شوخ بلائے جان
رفت از تن نزار دل وطاقت و توان
ہست آب پاش گورچہ جوئیم چشم خوں فشاں
دردا کہ سوخت الفت او مغز استخوان
اندر ہوائے عجب سینیش عاشقاں
با صد ہزار حسرت و غم سے دہند جان
واحسرتا چہ سنگدل ایں شوخ پُرفن است
جلاد عاشقاں و بُت مہر دشمن است

○

درد فراق و طعن جنود غم نگار
بُرد از من شکستہ دل طاقت و قرار
از بجر ابر بُرد گہر و چشم اشکبار
نخل قدم زغم سر و پا سوخت چوں چنار
پیرہن صبوریئے من گشتہ تار تار
از نشتر فراق شدہ سینہ ام فگار
یک جان زار و اینہمہ بیداد یا نصیب
یک دل لبینہ و اینہمہ ناشاد یا نصیب

گشت از دفور گریۂ و غم جان من تباہ
طفل دلم بمکتب غم خواندہ درس آہ
روئے یار لبسکہ شدہ مضطرب نگاہ
چشم سفید گشتہ و روز خوشم سیاہ
اقلیم درد و ملک الم راست بندہ شاہ
غم نالۂ آہ غصہ و فغان یک قلم سپاہ
اباد گشتہ از قدمم کشور جنون
صحرا و دشت خانۂ زنجیر بے ستون
سینہ خموش تا کہ ازیں قصۂ دراز
تا چند شرح حال خود و درد جانگداز
تا کہ فسانۂ غم دیں اندوہ مجاز
روئے نیاز آر بدرگاہِ بے نیاز
کز عین فضل و رحمت آں ذات کارساز
بر روئے تو درے ز حقیقت کند باز

من ہمچنیں ز جور و جفائش کشیدہ ام
از خوی مہر و شمن او خار چیدہ ام
صد دفتر از خصائل زشتش شنیدہ ام
از خود زبانش مائل اغیار دیدہ ام

○

زافسوس پشت دست بدندان گزیده ام
صد مرتبه قریب ہلاکت رسیده ام
این دل ولے چه چاره نه در قابوے آمدست
دشمن توی نهفته به پہلوی آمدست

○

افسوس کز جدائی شوخ جفا شعار
تن خوار و دل هبا نست جگر چاک وتن نزار
پے شمع روشن سوخت چو پروانه جاں نزار
زیں جوش موج گریه شود گر عجیب مدار
طوفاں نوح تازه ازیں چشم اشکبار
دردا که سوخت جان وتن از فرط انتظار
تا دور گشت قامت خویش قیامت است
صد مرحله بعید زعقلم سلامت است

○

باآنکه دو چشمه چشم روانست یم
سوز درون سینه من نیست هیچ کم
کس نیست مونس دل تنگم سرائے هم
شد از وفور غم تن زارم چو چنگ خم

○

ہردم قرین است با دل زارم ہزار غم
حیف اینچہ زندگیست کزو بہتر است عدم
در ہر دہن کہ بشنوی از من حکایت است
ہم دوست ہم عدو ہمہ گرم شکایت است

○

شد ملک دل ز یورش افواج غم خراب
در پیکرِ نحیف نزارم نماندہ تاب
تا گشت دل بسینۂ من وقف اضطراب
بگریخت صبر و تاب توان و قرار خواب
او خود نشد نصیبِ من زار ازآن جناب
از زندگی نصیبہ بجز نام چون حباب
حیف اینچہ زندگیست کزو مرگ بہتر است
آمد شدِ نفس بدلم تیغ و خنجر است

○

بنمود عیان بہار رہد انجم اشک خون
جوشش دو چند زد بسرم نشۂ جنون
ماندہ زنجیر پائے بگل عقل ذو فنون
شد ریان تن ز گردش اندوہ غم زبون

بستہ کمر بدشمنی ام داعی چرخ دون
بانکہ اشکم از حد اندازہ شد برون
ہر اشک گرچہ خونِ جگر را چکیدہ است
لیکن ز یاس رحمے اثر را ندیدہ است

وائے وائے زیست من کہ دل اندرو خوں شدہ
تن بیش کوہ غم چو پر کہ زبوں شدہ
افواج غم ز حصر و نہایت فزوں شدہ
زاں رایت شکیب و قرارم نگوں شدہ
دور از من آہ طاقت و صبر و سکوں شدہ
لختِ جگر باشک ز چشمم برون شدہ
دل نیست اینکہ در تن من وقف شیون است
صد آرزوئے خون شدہ را آہ مدفن است

سرائیکی کلام

سرائیکی زبان کی جائے پیدائش ؛ سرائیکی زبان کی عمر ؛ سرائیکی زبان کا وطن ؛ سرائیکی زبان کے حرف ؛ سرائیکی زبان کی خصوصیت ؛ سرائیکی ہی نہیں کسی ہی زبان کے متعلق کیئے گئے اُن سوالات کے جوابات پیش کرنا اتنا آسان نہیں جتنا کہ سمجھا جاتا ہے۔
طوفانِ نوحؑ ۔ باغِ عدن تک کے کھوج سراغ برآمد کرنے پڑتے ہیں۔
تاریخ عالم کے برفانی عہد میں دنیا کا تاریخ جغرافیہ آج کے حرف خانہ کعبہ اور کعبہ ہی کے اردگرد بستا بڑھتا پھیلتا ممکن تھا۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں مکّہ سے طائف تک کے سفر میں لق و دق صحرا میں میلوں اِدھر اُدھر بڑے بڑے دو سہ منزلہ عمارتوں کی بلندی جتنے ٹیلے ویکھے پتھر ایک دُوسرے سے دور بکھرے دیکھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ یہ صالحات باقیات کوہ عدن جس میں باغ عدن واقع ہوگا۔ کے گھسے پسے سموم کی آرہ کشیوں کی نوازش سے بچے کھچے نوادرات ہیں۔
برفانی عہد میں دُنیا کے وسط میں ... منطقہ ... میں واقع ہونے کی وجہ یہ معتدل آب و ہوا کا علاقہ کبھی اسی کوہستان عدن پر آباد ہوگا۔
اس سطح مرتفع کی معتدل آب و ہوا کا اثر ہوگا۔ کہ بے باغبان اور محکمہ زراعت کے ڈائریکٹران کی ہدایات کے بے نیاز باغِ عدن کے خودرو پھل جنت الفردوس کے سے مزے کے پھل پھول ہوتے ہوں گے۔
حضرت آدم اماں حوا کے بال بچے اُس زمانہ میں خود رو طعام خوردو کلام کے ایسے ہی عادی اور پروردہ ہوں گے۔ جس طرح سے آج کے معصوم بچے میداں حیران ... ماں کی چھاتیوں کا دُودھ پی پی کر غرّاتے مسکراتے بے قافیہ ردیف شعر بے معنی بے مطلب حرف و حکایات لیکن قدرتی طور پر انگور کے قدرتی رس

کی طرح پُرکیف، پُر وجد الہامات بیانات ارشاد فرماتے ہیں۔ گھبراور حرف نحو سے آزاد بے نیاز پتھروں تک کی سمجھ آجانے والی زبان میں باتیں کرتے ہوں گے۔ عربی زبان کے بعد آج کی سرائیکی زبان باغ عدن میں بولی جانے والی زبان کا ہی دھندلا چکا سا عکس ہے۔ لہٰذا سرائیکی زبان کی جائے پیدائش باغِ عدن اور سرائیکی زبان کی پیدائش کا سن دنیا کے عدم سے وجود میں آنے ہی کی تاریخ قرار پانا غلط نہ ہو گا۔ جائے پیدائش اور تاریخ پیدائش کے بعد سوال رہ جاتا ہے سرائیکی زبان کی عمر کا :۔

قدرتی اجسام اور قدرتی افکار کی عمر خود قدرت ہی کی طرح بیقراں و بے حساب ہے قادرِ مطلق ہی یہ کاریگری فرما سکتے ہیں کہ سو سال عمر کے بعد بڈھے کھوسٹ کے گر چکے دانت گر چکے بال پھر نکلنے اُگنے لگتے ہیں۔ سائنسدانوں، دندان سازوں کے بنائے ہوئے مصنوعی بال یا دانت بعث بعد الموت نہیں ہو سکتے۔ ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
ہر دم جواں پیہم دواں ہے زندگی

سرائیکی زبان کا وطن؟ سرائیکی زبان کا وطن وادئ دریائے دا لگا۔ وادئ رہ ہر اور دائی ہامس سس سپی اور ہوا ہنگو کی وادیاں بن سکتیں۔ ناممکن تھا جس طرح ہر گانے کے لئے ایک خاص وقت، ایک خاص ماحول کی ضرورت ہوتی ہے۔ سرائیکی زبان کے لئے عرب کا سا ماحول، ریت کے ٹیلے کھجور کے درخت اونٹ اور وحدانیت کا وہ حصہ جو گوبی اور کلہاڑی کے ریگستانوں کو عطا نہیں فرمایا گیا۔ ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا عمان جنت عدن کے علاقہ سے چل کر بحیرِ عمان کو عبور کر کے باغ عدن کی زبان، مضافات اوچ ملتان منصورہ ہی کے علاقہ میں متوطن ہو سکتی تھی۔ انگریزوں کا جنوبی افریقہ کینیڈا۔ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ۔ امریکہ میں متوطن ہونا ماحول کی یک رنگی ہی کی وجہ ہے۔ عربوں کو اس برصغیر میں ریڈی میڈ ہوا ان کو تاڑ۔ ناقہ بیاد کہتر و لبیار۔ دیگر اور پنڈ کھرما اکھیں دا سڑا حبیب اوچہ۔ ملتان۔ منصورہ کے مضافات میں مل گئے۔ تو پھر وہ ادھر ادھر کیوں جاتے۔ منظم طور پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ مخدوم الملک کے سرائیکی کلام میں جیسوں

مضمون ایسے ہیں جن پر کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔

سرائیکی زبان کے حرف

ایجادِ حروف بانیِ عدن کے ہی علاقہ کے عربوں کا محیر العقول کارنامہ ہے۔ بانیِ عدن کے علاقہ کے رہنے والے عرب اگر ایجاد ابجد نہ کرتے تو سٹری آف دی انگلش سپیکنگ نیشنز یارا مائن دھاکھا رت کنفوشش کے اقوال یونان کے فلاسفروں کے عقائد ژند و ژبور اور قرآن کریم جو حکمت والے کی حکمت کا نتیجہ مومنوں کے سینوں میں محفوظ ہے۔ اور انشاء اللہ تا ابد رہے گا۔ گیتا کا ڈرامہ امریکن اعلانِ آزادی کا نام و نشان تک مٹ گیا ہوتا۔ —— سرائیکی زبان کے حرف ابتدائی دور میں عربی حروف اور کسی زمانہ میں کڑکی حروف میں لکھے پڑھے جاتے تھے۔ لیکن آج اردو نستعلیق کی طرز پر بارہ حروف یعنی سات ثانوی حرفوں کے اضافہ کے ساتھ لکھے پڑھے جاتے ہیں۔

سرائیکی زبان کی خصوصیت

موجودہ سرائیکی زبان کی خصوصیت عربی، ترکی، فارسی بلوچی اور سنسکرت کے الفاظ کے ساتھ ساتھ نئے الفاظ کو سمو کر بارھویں صدی عیسوی کے اولیا کرام جن کی برِصغیر میں آمد ہوئی تبلیغ کا نتیجہ برِصغیر میں اسلام پھیلنے کا موجب ہوا۔ موجودہ میٹھی رسیلی محبت کی زبان کی تخلیق کا باعث اگر اولیائے کرام نہ ہوتے تو بجائے بیس کروڑ کے برِصغیر میں چند لاکھ ہی مسلمان رہ جاتے۔ قدرتی طور پر سرائیکی محبت لبریز زبان ہے۔ سرائیکی سے مزید استفادہ کرنے کے لئے اوچ کے سرائیکی مدرسہ فکر کی طرف منظم طور پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

○

کافی

بسم اللہ ماہی آ سائیں
میں وچھڑی دا اگن سوہا سائیں
آ ملیں ہاسک سکاندی کوں
گئی عمر دہا کرلاندی کوں
لا دامن میں ہتھ باندی کوں
نہ تھی توں بے وفا سائیں
ہے لطف خلیق الاون دا
مت چالا دل رنجاون دا
نہ رکھو طور ستاون دا
نہیں چنگا جو رجھا سائیں
کرو اجڑی جھوک آباد میری
تیسی موکھی دلڑی شاد میری
ایہا ول ول ہے فریاد میری
نال اکھیاں اکھیاں لا سائیں
بے عمل اوگن ہاری ہیں
ہاں کوجھی تے بدکاری ہیں
توڑیں فسق فجور دی ماری ہیں
میری لاج حیا دامن لا سائیں
جے میں وچ بھُل خطا سائیں
جا کر من ستید عطا سائیں
ہاں توں بن دست بے پا سائیں
میرا شاہد پاک خدا سائیں

کافی

تیری برہوں کیتا بے تاب سائیں
بیا جگ وچ مشہریں ہاب سائیں
جڈاں عشق تھیوسے حامی میاں
تری پکڑی ہیں خاص غلامی میاں
لکھ ڈکھڑے درد سلامی میاں
گیا وسر آرام تے خواب سائیں
گئی مار ہجن موجھ مونجھاری ہے
وچ پل پل بے قراری ہے
رہی دلڑی دردیں ماری ہے
گیا بھل سوال جواب سائیں
سید یار دنداں ایڑیں رد لیں ہا
آ ڈکھڑے میرے تولیں ہا
اپنے ہتھیں مشکل کھولیں ہا
تیرا لقب ہے بوتراب سائیں

کافی

نہ کیتو مول ملاپ سائیں
ہے دل وچ نانون پاپ سائیں
تھی بے پرواہ جلیندا ہیں
دھمکیندا شوخ الیندا ہیں
نہ ظلم کرن توں ویندا ہیں
تیرے کھاہ گئے سہاپ سائیں

جے سمجھ کے نہنیہ میں لانواں ہا
اینویں ڈر ڈر کیوں الانواں ہا
نہ اپنڑا ڈکھ نبھانواں ہا
چا موشم آپ کوں آپ سائیں
دل غم توں مول نہ ھٹدا ہے
پیا ول دل چوڑاں گھتدا ہے
بیڑا اینویں مول نہ ٹھندا ہے
کیتے مونجھ ستید ورد آپ سائیں
ڈتی عشق تیڑے وہ ڈات سائیں
آئی جندڑی سولاں وات سائیں
تارے گن گن رات نبھانواں یئں
نہ سوت تے پاسہ لانواں یئں
نقی لسمل پئی تڑ پانواں یئں
کراں رو رو نت برسات سائیں
میکوں تید غماں وچ سٹ گیوں
کیوں سانول جھوکاں پٹ گیوں
ڈس سونہڑاں کیا کجھ وٹ گیوں
دل پا یو مول نہ جھات سائیں

کافی

لگی عشق تیرے دی چاٹ سائیں
نہ سنجھیم گلی واٹ سائیں
بھا سوز دی نت بت سہنڈا ہے
ہاں اندر اڈو بالے کھاندا ہے

جیندی چاہ نہ او مہتھ آندا ہے
سہہ غمیں کھپائی ناٹ سائیں
یئں دانگ شالا نہ جیوے کوئی
نہ مول عذابی تھیوے کوئی
کیوں جام فراق دی پیوے کوئی
ہک آہ کڈھاں لکھ لاٹ سائیں
کوئی کیتے حسن دا بیتو چا
ٹھگ ڈاڈھی ٹھگی کیتو چا
دل کھس کے نال نہ نیتو چا
نالوں جوڑ چتا نوڑ راٹ سائیں
ہوئے سوز دے دلڑی بنڑ گئے
مونجھ تتی نال دنڑ گئے
دل تنڑ دے تنڑ دے تنڑ گئے
ڈوکھ گئے ہن دلڑی ڈاٹ سائیں

کافی

بیڑی دل کوں مونجھ ملاتے مایئں
کراں لکھ لکھ داہنہ فغات سائیں
تن روگ برہوں دا لگڑا ہے
وسنہ اساہ ثبت دا جھگڑا ہے
تھیا دشمن سارا جگ گڑا ہے
کیں نال کراں مشمات سائیں
وہ یار فائدہ تیڑی یاری دا
سکیہوں ہنر عجیب خونخواری دا

ایو ترس نہ گریہ زاری دا
پتیو خوشی دی مستحاشت سائیں
کیویں سخنج سر توں ٹلدی ہم
چھٹی نکھڑی روز ازل دی ہم
کیویں خوشی دل کوں بھلدی ہم
ڈوکھ اینم وچ میراث سائیں
ہُن جیون مُول نہ بھاندا ہے
جی وچ دو کھاندے رہندا ہے
دِل ماندا اینویں جھندا ہے
سید کرے نہ موت میکاث سائیں

کافی

تیڈے عشق روایا رج سائیں
گئے بھُر خوشی دے بھج سائیں
مندی بھلی تیڈی باندڑیاں
اُڈریں بھاندی تے انڑ بھاندڑیاں
تیکوں سبھوں دل دل چھنڈیاں
میڈی آپ پلیسو لج سائیں
جیں ڈینہہ میں اکھیاں لایاں ہم
گیاں خوشیاں بے مکلایاں ہم
بھج موہاں گل کوں لایاں ہم
گئی اُس دن دی دھج دج سائیں
پھوڑیں لا دی پیت کوں یاد کرو
غیسدا پور رہیا نہ برباد کرو

نوزیں گا ہے گا ہے چا یاد کرد
سر پیٹی نہ ہن بھج سائیں
نہ پچھڑ یار ہزاری توں
کو درد میرے دی کاری توں
بھج ڈیکھ نہ اوگن ہاری توں
ڈے پلڑو میکوں کج سائیں
میں توں جازی یار کیتے
سکاں سونڑیں بلبل رخسار کیتے
ہم حُب ستیہ سردار کیتے
شالا ملن تقسیم چ سائیں

کافی

گئی موئیں اندر وچ ہرج سائیں
نہیں کوڑے ہیے شک سچ سائیں
کر چیلے سے سے یار پٹھیم
سہہ درد دیاں لکھ ہار پیٹھیم
سارے تنرڈ ولڑی دے مار بیٹھیم
ڈتہ مول نہ خاطر وچ سائیں
ہیے میری مرض وچھوڑے وای
گلی وال نہ موکلڑ مروڑے اکوای
ساری عمر گذاریم جھورے دی
اے نہ میت نہیں ہے پنج سائیں
بھج سیج کنوں نہیہ لایم ہیں
چاسا واکیرم نہ کھاہم ہیں

ستید آپ کوں آپ موسایم ہیں
تن بر ہوں مچپا یا پہچ سائیں

کافی

جڈاں عشق دی مگڑی بھج سائیں
کیا نام نسب تے رنج سائیں
تیری بے پرواہی کھانڈڑی ہے
ایہا نزلیست نہ اصلوں بھاندڑی ہے
ہر وال منڈھوں رت آندڑی ہے
تھی جندڑی گیم تلخ سائیں
اپنے غم کوں کتھاں وچ رولاں
ہیں جیہاں کیڈے وں یار گولاں
توڑیں ہند سندھ وچ پنجاب پھولاں
توڑیں ڈھونڈاں حبش بلخ سائیں
رب پردے اندر وسدا ہے
نہ راز او اپنا ڈسدا ہے
او مالک کس بے کس دا ہے
کیا ننگ تے ہور ملخ سائیں
اے دہن سن لاتوں عشق کیہاں
پوکھا داشق جان دلال جیہاں
وچ پل پل سہن ڈکھ ویہاں
بیا ڈوکیں دی لکھ پنج سائیں
ستید کیتا یار ازاری نہ ہے
بیماری دی ویدن باری ہے

تھیا ضعف بدن وچ طاری ہے
ہتھ پیر سارے تھیئے یخ سائیں

کافی

کیتا عشق تیڈے برباد سائیں
کراں رو رو لکھ فریاد سائیں
ماہی لا یار برہوں پلیتڑا توں
میکوں مار کٹھا کر نیتڑا توں
چا کیت حسن دا پیتڑا توں
نہ کوک سینے نہ داد سائیں
ماہی غم دے مارو تیر ہوندے
وچ لوں لوں رگ رگ چیر ہوندے
اوکھے حال تے سخت زہیر ہوندے
کر ڈیندے بےلے بنیا د سائیں
لیسے رب دے کم نرالے ہن
سئے صاف سئے ونگ ڈیوالے ہن
کئی زیرک تے کئی گاہلے ہن
کئی موجے تے کئی شاد سائیں
ہک ول کھیو بیا ہسدا ہیں
رل نال رقیباں وسدا ہیں
میتھوں یار برہوں دے وسدا ہیں
میں چور شاید توں شاد سائیں
ہک واری سیّد انویں ہا
چا انگن میرے پون پانویں ہا

اُلطف سمجھ لگ لاندیں نہ
کر لئے کہ اعوار کا سایتں
اُو لگیاں کیتی